فروغِ فکر و آگہی کے لیے

ماہنامہ

پیام

اسلام آباد

ABC سے تصدیق شدہ اشاعت

جولائی/اگست 2023ء

محرم/صفر ۱۴۴۵ ہجری



جدید اسلامی تہذیب
خصوصی نمبر

حکومت پنجاب کی طرف سے تعلیمی اداروں اور پبلک لائبریریز کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ پیام اسلام آباد

فروغ فکر و آگہی کے لیے

جلد 26 شمارہ 05-06

ABC سے تصدیق شدہ اشاعت

Regd. No. ID 311

ISSN 1562-0018

PO Box No 416
Islamabad
051-2218005
+92 306 5566771

شمارہ ھذا: -/150 روپے   زر سالانہ -/1000 روپے

زر سالانہ امریکہ، کینیڈا، یورپ -/190 ڈالر

مڈل ایسٹ -/90 ڈالر

publications@albasirah.com
www.albasirah.com
ukhuwat@gmail.com
murtaza@albasirah.com

کرنل (ر) اعجاز حسین نے نوید نعمت پرنٹرز اسلام آباد سے چھپوا کر البصیرہ، شاہ اللہ دتہ اسلام آباد سے شائع کیا۔

اداریہ

بچپن سے ہمارے گھر میں تہذیب اور بدتہذیبی کے الفاظ سننے کو ملتے تھے اوراس حوالے سے بہت ساری ہدایات دی جاتی تھیں مثلاً جوتا اس رنگ کا پہنو، شلوار بیٹھ کر پہنو، رات کو جھاڑو نہ لگاؤ، چراغ کو پھونک سے نہ بجھاؤ اور آذان کے وقت لیٹے نہ رہو وغیرہ وغیرہ بعد ازاں معلوم ہوا یہ تو تہذیب الاحکام سے اخذ کی گئی باتیں ہیں۔ بعض پر ہم نے عمل کرلیا بعض پر عمل نہ کر سکے۔ اسی طرح ہمارے گھر میں میر انیس اور مرزا دبیر کے مرثیوں کی کتابیں موجود تھیں جنھیں ہمارے گھر کی خواتین فرصت کے لحات میں پڑھا کرتی تھیں۔
اسے بھی پرانی تہذیب کا شاخسانہ کہا جاسکتا ہے گو کہ یہ قصہ پرانا ہوگیا۔
جب اسکول میں جانے لگے تو علامہ اقبال کی نظموں سے آشنائی ہوئی تو ان کا یہ شعر تو ازبر ہوگیا

اٹھا کر پھینک دو گلی میں
نئی تہذیب کی انڈے ہیں گندے

اس سے یہ بات اساتذہ نے سمجھائی کہ نئی تہذیب خراب ہے اوراس سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اقبال کا کہا سر آنکھوں پر۔

فساد قلب و نظر ہے فرہنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ نہ سکی عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

ہمارے دیگر شعراء نے بھی تہذیب کو کئی رنگ سے باندھا ہے۔ اس میں ساحرلدھیانوی کی نظم کسی دور میں بہت مشہور تھی جس کا ایک شعر پوری نظم کا خاصہ ہے۔

میرے احباب نے تہذیب نہ سیکھی ہوگی
میرے ماحول میں انسان نہ رہتے ہوں گے

تہذیب، تمدن اور ثقافت' تینوں عربی الاصل الفاظ ہیں، اپنے لفظی معنی میں فرق کے باوجود ان الفاظ کے درمیان مجموعی اشتراک انھیں باہم مترادف بنادیتا ہے۔ آسان لفظوں میں کہیں تو گا ہے تمدن کو تہذیب کے اور تہذیب کو ثقافت کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔
تہذیب کے لغوی معنی 'کھجور کے درخت سے چھال اتارنا یا صاف کرنا' کے ہیں۔ ان معنی کی رعایت سے اس لفظ میں 'آراستگی، شائستگی، اصلاح، ادب و آداب اور ترتیب و تدوین' کا مفہوم پیدا ہوا، یوں ذہنی ترقی، طرز معاشرت اور تمدن' کو بھی 'تہذیب' کہا گیا۔
دنیا کی تمام تہذیبوں اور ثقافتوں کے مقابلے میں اسلام کی تہذیب و ثقافت بالکل منفرد اور امتیازی خصوصیات کی حامل ہے۔ اس کی بنیادی وجہ وہ اُصول وضوابط اور افکار و نظریات ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اُسوہ حسنہ کے ذریعے اُمتِ مسلمہ کو عطا فرمائے ہیں۔ ثقافت کی تمام ترجہات میں اُسوہ

حسنہ سے ہمیں ایسی جامع راہنمائی میسر آتی ہے جس سے بیک وقت نظری، فکری اور عملی گوشوں کا احاطہ ہوتا ہے۔ ایسی جامعیت دنیا کی کسی دوسری تہذیب یا ثقافت میں موجود نہیں ہے۔ مغربی مفکرین اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں اپنے تمام تر تعصبات کے باوجود اسلام کی عظیم الشان تہذیب اور ثقافت کی نفی نہیں کر سکے۔ انھیں برملا اعتراف کرنا پڑا کہ مسلمانوں نے یورپ کو تہذیب کی شائستگی کی دولت ہی سے نہیں نوازا بلکہ شخصیت کی تعمیر و کردار کے لئے بنیادیں فراہم کیں، تاریکی میں ڈوبے ہوئے یورپ کو ثقافت کی روشنی سے ہمکنار کیا، جنگل کے قانون کی جگہ ابن آدم کو شرف انسانی کی توقیر و احترام کا شعور عطا کیا اور یوں اس کرہ ارضی پر ان مہذب معاشروں کے قیام کی راہ ہموار کی جو آج بھی تاریخ کے ماتھے کا جھومر ہیں۔

رہبر انقلاب اسلامی سید علی خامنہ ای کا کہنا ہے کہ عالم اسلام کی ذمہ داری ہے کہ وہ دنیا میں ایک نئی روح پھونکے، جیسا کہ ختمی مرتبتؐ نے کیا، تاکہ ایک نیا ماحول تشکیل دیا جائے اور نئی راہیں کھلیں۔ ہم اس نئے تصور کو "جدید اسلامی تہذیب" کا نام دیتے ہیں۔ ہمیں انسانوں کے لیے اس نئی تہذیب کی تگ و دو کرنی ہے۔ یہ تصور اس تصور سے بالکل مختلف ہے، جو آج کی طاقتیں انسان کے بارے میں رکھتی ہیں۔ اس سے مراد زمینوں کو فتح کرنا نہیں ہے۔ اس سے مراد اقوام کے حقوق غصب کرنا نہیں ہے۔ اس سے مراد کسی پر عقائد اور ثقافت کو مسلط کرنا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد اقوام کو ایک الٰہی تحفہ پیش کرنا ہے، تاکہ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے درست راہ کا انتخاب کریں۔

یہ موضوع پرانا تو ہے مگر یہ ہماری پاکستانی ترجیحات میں نہیں ہے۔ میرا مطالعہ بھی اس حوالے سے واجبی سا رہا مگر جب جدید تہذیب اسلامی کے موضوع پہ مجلہ مرتب کیا تو اس کے کئی گوشے آشکار ہوئے۔ مدیر اعلیٰ پیام نے اس عزم کا اظہار کیا ہے اس بحث کو مزید کھولنے کے علمی کام کریں گے جس ایک اظہار اس موضوع پر یہ خصوصی شمارہ ہے۔ مطالعہ کیجیے اور اپنی قیمتی رائے بھی عنایت کیجیے۔

ملک پاکستان میں قومی اسمبلی اپنی مدت پوری کر کے ماضی کا حصہ بن چکی ہے جب کہ پنجاب اور خیبر پختونخوا کی صوبائی اسمبلیاں ایک عرصے سے تحلیل ہو چکی ہیں۔ نگران حکومتیں غیر معینہ مدت کے نگران ہیں کس قانون اور قاعدے کے چل رہی ہیں کسی کے علم میں نہیں ہے۔ سپریم کورٹ کا فیصلہ بھی صورت حال میں تبدیلی نہ لا سکا۔ مہنگائی مہنگائی اور مہنگائی اب یہ فرمان نافذ عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری ملک پر رحم فرمائے اور عوام بھی اس مرتبہ ووٹ سوچ سمجھ کر دیں۔ کم از کم وراثتی اقتدار کے خلاف اپنا ضمیر کا ووٹ دیں۔ مہنگائی میں جہاں ہر چیز کو متاثر کیا وہی کاغذ، پرنٹنگ اور ترسیل طباعتی مواد بہت مہنگا ہو چکا ہے ایسے میں مجلہ شائع کرنا بہت مشکل ہو چکا ہے۔ اس لیے طے پایا ہے کہ پیام دو ماہ کا یکجا شائع کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ

قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اس مجلہ کے فروغ و اشاعت میں تعاون و مالی تعاون کیا جائے۔

ہمارے پیارے بھائی سید ثاقب اکبر مرحوم کو اپنی خصوصی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

ہم سے تہذیب کا دامن نہیں چھوڑا جاتا
دشت وحشت میں بھی آداب لیے پھرتے ہیں (فراغ روہوی)

مدیر ماہنامہ پیام
سید نثار علی ترمذی

اسلامی تہذیب کی تشکیل میں اہل بیتؑ کا کردار

سید رمیز الحسن موسوی

کلیدی کلمات:

تہذیب وتمدن، مدنیت، شیعہ، تشیع، فاطمی، آل بویہ، تفسیر، فقہ، تحریک ترجمہ۔

خلاصہ:

اکثر مسلمان مورخین نے اپنے سیاسی اور مسلکی مفادات کے پیش نظر اسلامی تہذیب کی تشکیل اہل تشیع کے تاریخی کردار کو درست بیان نہیں کیا۔ انھوں نے اسلامی تہذیب کی تشکیل کا کارنامہ فقط خلفائے کرام اور چند مسلمان حکمرانوں کے نام لکھا۔ حالانکہ تاریخ کے گہرے مطالعہ سے ایسے واضح نشانات ملتے ہیں جو اسلامی تہذیب کی تشکیل میں آئمہ اہل بیتؑ اور ان کے پیروکاروں (امامیہ اثناعشریہ، زیدیہ، اسماعیلیہ) کے کردار کو نمایاں کرتے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامی تہذیب کی تشکیل میں حضرت امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہا السلام اور آپ کے شاگردوں نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ مختلف علوم و معارف کسی بھی تہذیب وتمدن کی اساس شمار ہوتے ہیں۔ اسلامی تہذیب میں تفسیر، فقہ، فلسفہ و کلام، حدیث وغیرہ جیسے اسلامی علوم کی آبیاری میں ان ہستیوں کا کردار، اسلامی تاریخ تہذیب وتمدن کی تشکیل کا ایک ناقابل انکار باب ہیں۔ اس مقالہ میں آئمہ اہل بیتؑ اور ان کے شیعوں کے اسی کردار کو اجاگر کیا گیا ہے۔

تمہید:

عموماً اسلامی تاریخ کے مورخین نے حکمرانوں کے زیر تسلط ہونے کی وجہ سے شیعہ امامیہ کے تاریخی کردار کو اس طرح پیش نہیں کیا جس طرح ان کا حق تھا اور آج اسلامی تہذیب وتمدن کی تشکیل میں مسلمان خلفاء اور حکمرانوں ہی کو پیش کیا جاتا ہے اور آئمہ اہل بیت اطہار علیہم السلام کا علمی اور معنوی کردار اسی تعصب کا نشانہ بن جاتا ہے جس کی بنیاد اموی اور عباسی حکمرانوں نے رکھی تھی لیکن اس کے باوجود تاریخ کے گہرے مطالعہ سے بہت سے ایسے واضح نشانات ملتے ہیں جو اسلامی تہذیب میں اہل بیت اطہارؑ اور ان کے پیروکاروں کے نقش قدم کو نمایاں طور پر پیش کرتے ہیں۔ اس مقالے میں انہی نقوش کو پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

جولائی/اگست 2023

محرم/صفر ۱۴۴۵ھ

تہذیب وتمدن کی تعریف

اس سے پہلے کہ ہم اصل موضوع کی طرف آئیں، خود کلمہ "تہذیب وتمدن" کی تعریف وتوصیف کرنا ضروری سمجھتے ہیں تا کہ قاری کو اس تحریر میں اس کلمے کے استعمال کا ادراک ہو سکے۔ تہذیب کو انگریزی میں سویلائزیشن اور عربی وفارسی میں تمدن کہتے ہیں۔ تہذیب ایک ایسا گہوارہ ہے جس میں انسانیت پروان چڑھتی ہے، انسان کا تشخص قائم ہوتا ہے، اس کی شناخت ہوتی ہے، اس کے لیے ترقی کی راہیں ہموار ہوتی ہیں اور اس کو اپنا کر وہ زندگی کے مراحل طے کرتا ہے اور دوسری اقوام وملل سے ممتاز ہوتا ہے۔ ثقافت (کلچر) اور تہذیب (سویلائزیشن) کی اصلاحات عمرانیات، تاریخ اور فلسفے کے مباحث میں استعمال ہوتی ہیں۔ البتہ ان کی فنی تعریف میں اختلاف نظر پایا جاتا ہے لیکن بعض اوقات ان دونوں کو مترادف بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

تمدن کے عنوان سے کتابیں لکھنے والے علماء دانشوروں اور لغت نویسوں کے مطابق تمدن "مدینہ" سے ماخوذ ہے جس کا معنی "شہر" ہے۔ اس لحاظ سے تمدن اور مدنیت (شہر نشینی) مترادف ہیں لیکن اس کے اصطلاحی معنی کے مطابق تہذیب وتمدن کا اطلاق انسانی زندگی کے اس مرحلے پر ہوتا ہے کہ جب انسان ترقی اور پیش رفت کر لیتا ہے اور ابزار وآلات سے استفادہ کرنے لگتا ہے یعنی اپنی زندگی میں تبدیلی لاتے ہوئے وہ رفاہ وآسائش حاصل کر لیتا ہے۔ ایک مغربی دانشور کے مطابق انسان اب تک تہذیب وتمدن کے تین مراحل طے کر چکا ہے:

سب سے پہلا مرحلہ وہ ہے جب انسان زراعت اور کھیتی باڑی سے آگاہ ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں انسان کھیتی باڑی اور ذخیرہ اندوزی سے آگاہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اس مرحلے میں انسان کی زندگی میں ایک تبدیلی واقع ہوتی ہے، اس کو "زرعی تہذیب وتمدن" کہا جاتا ہے۔

انسانی تہذیب وتمدن کا دوسرا مرحلہ وہ ہے جب انسان "صنعت" سے آگاہ ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں انسان صنعت وحرفت کو استعمال میں لاتا ہے اور آہن اور فولاد پر مسلط ہو جاتا ہے۔ انسانی تہذیب وتمدن کا تیسرا مرحلہ ہمارے معاصر زمانے کا تمدن ہے، اسے ہم "سائنسی تمدن" کہتے ہیں۔ اس مرحلے میں جو ملک وقوم جس قدر سائنس اور ٹیکنالوجی سے بہرہ مند ہوگی، اسی قدر دوسروں سے زیادہ پیشرفتہ اور ترقی یافتہ کہلائے گی۔ اس لیے تمام ممالک کو انہی تین قسم کے تمدنوں کے لحاظ سے تین انواع میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

مادی اور معنوی تہذیب وتمدن

تہذیب وتمدن مادی بھی ہو سکتا ہے اور معنوی بھی۔ مادی تمدن سے مراد صنعت، زراعت، سائنس وٹیکنالوجی ہے جس کو موجودہ دور میں سائنسی ترقی کا نام دیا جاتا ہے جب کہ معنوی تمدن سے مراد انسانی معاشروں کا مسالمت آمیز زندگی سے بہرہ مند ہونا ہے۔ یہ تہذیب وتمدن کی اعلیٰ ترین قسم شمار ہوتی ہے۔ یعنی کسی معاشرے کے متمدن ہونے کے لیے یہی کافی نہیں کہ وہ صنعت اور ٹیکنالوجی سے بہرہ مند ہے (یہ بھی ایک تمدن ہے لیکن تمدن کی مطلوبہ اور آئیڈیل شکل نہیں اور نہ یہ اس سے انسان کو سعادت اور خوش بختی حاصل ہو سکتی ہے) بلکہ ایک آئیڈیل اور پسندیدہ تہذیب وتمدن وہ ہے جس میں انسان فکر وسوچ کے لحاظ سے بالغ ہو جائے اور کم از کم اس طرح زندگی گذارنے کے قابل ہو جائے کہ اس کے ہاتھ سے کسی دوسرے انسان کو نقصان نہ پہنچے۔

یہ وہی مرحلہ ہے جس کی طرف اسلام انسانوں کو لے جانا چاہتا ہے جیسا کہ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ

اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔ تہذیب وتمدن کی یہ (مادی ومعنوی) تقسیم تمدن کے لغوی معنی کے ساتھ زیادہ تناسب رکھتی ہے کیونکہ "مدینہ" (شہر) کے لفظ میں تہذیب وثقافت کا وجود ضروری ہے، لیکن بدوی (خانہ بدوش) اور غیر مہذب معاشروں میں اس قسم کی کسی چیز کا تصور نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا جب ایک معاشرہ بدویت سے مدنیت کی طرف آتا ہے تو اس وقت اسے مہذب و متمدن کہا جاتا ہے۔

البتہ یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ تہذیب وتمدن کو ان دو معنوں میں تقسیم کرنا درست ہے اور اس کی دوسری قسم (معنوی) تمدن پہلی قسم (مادی تمدن) سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے لیکن اصطلاحاً جب تمدن کہا جاتا ہے تو زیادہ تر اس کا مادی پہلو ہی مدنظر ہوتا ہے۔ یعنی ایک ایسے معاشرے کو متمدن سمجھا جاتا ہے جو صنعتی اور سائنسی لحاظ سے ترقی یافتہ ہو۔

لہٰذا ضروری ہے کہ اس مقالے میں تہذیب وتمدن کے ان دونوں معانی کو مدنظر رکھا جائے البتہ اہل دین ودیانت کی نظر میں صنعتی اور سائنسی تمدن ہی انسانی سعادت کے لیے کافی نہیں ہے لیکن ممکن ہے مغربی دانشور اور دوسرے غیر دینی مکاتیب فکر اس بات کو قبول نہ کریں۔ چونکہ مغربی دنیا پر حاکم قدروں کے مطابق معنوی ترقی وپیش رفت سے زیادہ مادی ترقی وپیش رفت زیادہ اہم ہے۔ اسی لیے آج تک مغرب میں صنعت اور سائنس کو انسانیت کی تخریب میں استعمال کیا گیا ہے اور انسانی صلاحیتوں کو جنگی اسلحہ میں ترقی اور کمزوروں پر مسلط ہونے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لیے ہمارے نزدیک فقط مادی تمدن ہی کافی نہیں اس کے ساتھ معنوی تہذیب وتمدن بھی ضروری ہے جس کی ہمارے دین نے بہت زیادہ تاکید کی ہے۔ بہرحال گزشتہ بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر معاشرے میں انسان کی معنوی اور مادی کوشش کے نتیجے میں ہی تہذیب وتمدن وجود میں آتا ہے۔

اسلامی تہذیب وتمدن کا تعارف

اسلامی تہذیب وتمدن سے مراد مسلمانوں کی وہ ترقی اور پیش رفت ہے جو اسلامی تعلیمات کے نتیجے میں وجود میں آئی۔ اس میں تمام علوم وفنون شامل ہیں جن میں مسلمانوں نے ترقی کی اور ان کے دنیا میں پھلنے پھولنے میں کردار ادا کیا۔ مثلاً طب وسائنس، فلسفہ اور کلام اور دوسرے علوم وفنون جن میں مسلمان علماء اور دانشوروں کی کوشش کو تاریخ نے ثبت کیا ہے۔ اسی طرح عظیم الشان کتابخانوں، علمی مدارس اور تاریخی عمارتوں کی تاسیس اور انسانی آسائش ورفاہ کے کاموں میں مسلمانوں نے جو کوششیں کی ہیں وہ بھی اسلامی تہذیب وتمدن کا ایک اہم حصہ ہیں۔

اسلامی تمدن کا سرچشمہ اسلامی تعلیمات اور اسلامی افکار ہیں۔ پیغمبر اسلامؐ اور دوسرے بزرگان دین نے علم ودانش کے حصول کی تشویق پر مبنی جو فرامین اور ہدایات دی ہیں، انھی سے اسلامی تمدن کی بنیادیں فراہم ہوئی ہیں۔ اسی طرح اغیار کے تمدن سے آشنا ہونے کے بعد اور دوسرے ممالک کے مسلمان علاقوں میں شامل ہونے کی وجہ سے اسلامی تمدن نے مزید ترقی اور پیش رفت کی ہے۔ اسلامی تمدن میں علم ودانش کے حصول کے بارے میں پیغمبر اسلامؐ کی خصوصی توجہ کی وجہ سے اس تمدن نے دوسرے تمدنوں سے بھی اقتباس کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کیا اور "حکمت مومن کی گمشدہ میراث ہے، اسے جہاں پاؤ حاصل کر لو" جیسی احادیث نے مسلمانوں کو دوسرے تمدنوں سے اچھی چیزیں لینے میں مدد دی ہے۔ اسلامی تہذیب وتمدن کی دوسرے تمدنوں پر فوقیت کے بارے میں آیت اللہ سید علی خامنہ ای لکھتے ہیں:

"اسلام میں روز اول سے ہی شروع ہونے والی علمی تحریک کی برکت سے اسلامی تہذیب وتمدن کو وجود ملا۔ اسلام کے ظہور کو

ابھی دو صدیاں بھی نہیں گزری تھیں کہ اسلام کی برق رفتار علمی تحریک شروع ہوگئی، وہ بھی اس دور کے ماحول میں۔ اگر آپ اس وقت کی علمی تحریک کا موازنہ کرنا چاہتے ہیں تو دنیا کے موجودہ علمی مراکز کو پیش نظر رکھیے اور پھر فرض کیجیے کہ کوئی ملک دنیا کے کسی دور دراز کے علاقے میں واقع ہے جو تہذیب و تمدن سے پوری طرح بے بہرہ ہے۔ یہ ملک تہذیب و تمدن کے میدان میں ایک دم داخل ہو اور سو یا ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں علمی لحاظ سے تمام تہذیبوں پر فوقیت حاصل کرلے۔"(۱)

شیعہ و تشیع

تاریخ اسلامی میں کلمہ تشیع اور شیعہ تین معنوں میں استعمال ہوا ہے:

۱۔ شیعہ اور تشیع اپنے خاص معنی میں کہ جس سے مراد حضرت علی علیہ السلام کی خلافت بلا فصل ہے جس کے تمام امامیہ اور شیعہ فرقے قائل ہیں۔

۲۔ خلیفہ سوم حضرت عثمان کے قتل کے بعد ایک گروہ تو ان کا حامی رہا جب کہ مسلماوں کی اکثریت نے حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کرلی تھی۔ اس اکثریت نے حضرت عثمان کی حمایت نہیں کی۔ انھیں بھی شیعیان علی کہا جانے لگا اگر چہ یہ اکثریت اپنے خاص معنی میں شیعہ اعتقادات نہیں رکھتی تھی اور یہ لوگ پہلے دو خلفاء کو بھی قبول کرتے تھے۔ یہاں شیعہ سے مراد حضرت علیؑ کے سیاسی حامی ہیں، جو "شیعہ عثمان" یا "عثمانیہ" (۲) کے مقابلے میں "شیعہ علیؑ" کہلائے۔ اعتقادی حوالے سے وہ شیعہ نہیں تھے لیکن سیاسی عنوان سے وہ حضرت علیؑ کو اپنا پیشوا مانتے تھے۔ انھیں ہم اصطلاحی شیعہ نہیں کہہ سکتے۔

۳۔ بطور کلی جو بھی محب اہل بیتؑ تھا تاریخ میں وہ شیعہ کے عنوان سے مشہور ہوگیا۔ مثلاً بعض معتزلی علماء کہ جو اصطلاح خاص کے مطابق شیعہ نہیں تھے لیکن از نظر علم و فضیلت حضرت علی علیہ السلام کی تفضیل کے قائل تھے، شیعہ معتزلی کہلانے لگے۔ آج بھی بہت سے محبان اہل بیتؑ ہیں جو فقہی اعتبار سے مذاہب اہل سنت کے پیروکار اور خلفاء کی خلافت کے قائل ہیں لیکن تفضیل علیؑ کا اعتقاد رکھتے ہیں اور دشمنان علیؑ سے اظہار بیزاری کرتے ہیں۔

اس مقالے میں شیعہ سے مراد اس کا خاص معنی ہے یعنی اصطلاحی شیعہ مراد ہیں جو حضرت علی علیہ السلام کو خلیفہ بلا فصل مانتے ہیں اور اس مقالے میں شیعی تہذیب و تمدن سے مراد بھی وہی تمدن ہے جو تمام شیعہ فرقوں (امامیہ اثنا عشریہ، زیدیہ، اسماعیلیہ) کو شامل ہے۔

معنوی تہذیب و تمدن میں شیعوں کا حصہ

مادی تمدن کے لیے مادی وسائل کی ضرورت ہوتی ہے لیکن افسوس کے ساتھ ان وسائل سے شیعہ پوری تاریخ میں محروم رہے ہیں۔ اس قسم کے وسائل یا تو تھے ہی نہیں اگر تھے بھی تو بہت کم، کیونکہ مسلمان حکومتوں کے سربراہ شیعیت کے سیاسی اصول مبانی سے خائف رہے ہیں۔ شیعیان اہل بیتؑ پر ہونے والے ایسے ایسے مصائب ثبت ہیں کہ جن کو پڑھ کر آج بھی انسان کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اگر کسی علاقے میں ایک مختصر عرصے کے لیے کوئی شیعہ حکومت تشکیل پائی بھی ہے تو مادی لحاظ سے وہاں شیعہ تمدن کے اثرات واضح دیکھے جاسکتے ہیں۔ مثلاً مصر میں فاطمیوں کی حکومت یا آل بویہ کی حکومت میں شیعی اسلامی تمدن کافی حد تک

پھلا پھولا ہے اور اس نے بہت سے اہم کام انجام دیے ہیں۔

البتہ معنوی پہلو سے مسئلہ اس کے برعکس ہے چونکہ شیعہ اہل بیت اطہار علیہم السلام کے پیروکار تھے۔ ان کے مطابق اہل بیت اطہار علیہم السلام ہی اسلامی علوم کا سرچشمہ تھا۔ لہذا معنوی لحاظ سے شیعہ تمام اسلامی فرقوں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً آئمہ اطہار علیہم السلام سے منقول احادیث اور روایات کی وجہ سے شیعہ ایک بہت ہی وسیع اور بلند مرتبہ معارف پر مبنی تہذیب وتمدن تشکیل دینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان احادیث اور آیات کی ایک بڑی تعداد امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام سے نقل ہوئی ہے۔ ائمہ اطہارؑ سے منقول یہ علوم ومعارف بنی امیہ اور بنی عباس کے درمیان سیاسی چپقلش اور اقتدار کی منتقلی کے دوران عوام الناس میں عام ہوئے ہیں، چونکہ واقعہ کربلا کے بعد بنی امیہ کے دور میں شیعوں کے چوتھے پیشوا، حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کا دور سیاسی حوالے سے انتہائی سخت دور تھا، جس میں سیاسی فعالیت تو کہاں علمی اور ثقافت کام کرنا بھی بہت مشکل تھا۔ اس دوران امام زین العابدینؑ جیسے ستم دیدہ دینی پیشوا دعاؤں کے قالب میں اسلامی معارف کو بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں اور دعا و مناجات کے ذریعے لوگوں میں اسلامی تہذیب وتمدن کے بیج بونے کی سعی کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے امام زین العابدین سے منقول دعا ومناجات کا مجموعہ ''صحیفہ کاملہ'' ہمارے معنوی تمدن کا ایک عظیم سرمایہ شمار ہوتا ہے۔

اسی طرح امام باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام کو جب دو سیاسی قوتوں کے درمیان چپقلش اور اقتدار کی منتقلی کی وجہ سے فرصت ملی ہے، اس سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے قرآنی اور نبوی علوم ومعارف کی ترویج کی زبردست مہم شروع کی جاتی ہے۔ اس دوران، ان دو ائمہ اہل بیتؑ سے منقول احادیث اور روایات ایک ایسا عظیم علمی ذخیرہ وجود میں آتا ہے جو شیعی اسلامی تمدن کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔ بنابریں شیعوں نے معنوی تمدن کے لحاظ سے دوسرے اسلامی فرقوں کی نسبت بہت زیادہ ترقی کی ہے۔ جس کے اثرات جدید دور میں مزید نکھر کر ظاہر ہو رہے ہیں چونکہ جس فکری امنیت اور عملی اخلاق سے شیعہ بہرہ مند ہیں اس سے دوسرے فرقے بہرہ مند نہیں ہیں اور یہ سب آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی احادیث کی برکت سے ہے۔ امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام نے اسلامی تمدن کے دونوں (مادی اور معنوی) پہلوؤں میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ مادی پہلو سے دیکھیں تو کیمسٹری کے مشہور سائنس دان جابر بن حیان جیسے شاگرد اور معنوی پہلے سے ہشام بن حکم جیسے متکلم کی پرورش انہی ہستیوں کی ہے۔

تاریخی شواہد سے پتا چلتا ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے چار ہزار شاگرد تھے کہ جنھوں نے مختلف علوم وفنون میں امام علیہ السلام سے علم حاصل کیا ہے۔(۳) کہتے ہیں ایک شخص امام علیہ السلام کی خدمت میں مناظرے کی غرض سے آیا تو آپؑ نے علم کلام، فقہ اور لغت کے شعبوں سے ہر ایک شعبے کے لیے ایک شاگرد کو اس شخص سے مناظرہ کرنے کا حکم دیا۔(۴) یہ جو مشہور ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے چار ہزار شاگرد تھے تو اس سے یہ مراد نہیں کہ امام علیہ السلام آج کل کی طرح ایک مدرسے کی عمارت بنائی ہوئی تھی اور اس میں چار ہزار شاگرد آپؑ سے درس لے رہے تھے بلکہ مراد یہ ہے کہ چند سالوں کے دوران بہت سے افراد امام علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے ہیں اور آپ سے علم حاصل کرنے کے بعد ان کا شمار آپؑ کے شاگردوں میں ہونے لگتا تھا۔

جیسا کہ حنفی مذہب کے بانی ابوحنیفہ کا شمار بھی امام جعفر صادق علیہ السلام کے شاگردوں ہوتا ہے۔ مشہور ہے کہ اس بات کا اعتراف خود ابوحنیفہ نے ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے: ''لولا السنتان لہلک النعمان'' اسی طرح مذہب مالکی کے امام، مالک بن انس بھی امام علیہ السلام کے شاگردوں میں سے ہیں۔ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے ایک محدود زمانے اور محدود علاقے میں جب بھی شیعوں کو

حکومت تشکیل دینے کا موقع ملا ہے، انھوں نے مادی لحاظ سے بھی اسلامی تمدن کی بنیادیں مضبوط کرنے کی سعی کی ہے اور اس سلسلے میں اہم کام انجام دیے ہیں۔ جیسا کہ مصر میں فاطمیوں کی حکومت اور ایران میں آل بویہ کی حکومت نے اسلامی تہذیب وتمدن کے لیے اہم کام کیے ہیں۔

لیکن تاریخ گواہ ہے کہ شیعہ ایک طولانی عرصے کے لیے حکومت سے کبھی بھی بہرہ مند نہیں ہوئے لیکن انھیں جب بھی موقع ملا ہے اور اپنی مختصر حکومتوں میں بھی اسلامی تمدن کے اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں۔ جنھیں مورخین نے مسلمانوں کے علمی کارناموں کے ضمن میں ذکر کیا گیا ہے اور شیعہ حکومتوں کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ مثلاً شہر سازی، ہسپتالوں کی تعمیر وتاسیس، بند سازی، زراعت اور کھیتی باڑی میں ترقی، علمی مدارس اور علمی ودینی مراکز کی تاسیس بعض شیعی حکومتوں کا اہم کام ہیں۔

اس سلسلے میں تمام شیعہ حکومتوں خواہ وہ بغداد اور ایران میں آل بویہ ہوں یا ہمدانیوں کی حکومت ہو یا مصر میں فاطمیوں کا حکومتی سلسلہ ہو، (۵) ان سب نے مادی ترقی میں بہت زیادہ کام انجام دیے ہیں۔ (۶) مثلاً بغداد میں "عضدی ہسپتال" اور شیراز میں "بند امیر" عضدالدولہ بختی اور شیعی حکومت کی یادگاریں ہیں۔ چوتھی اور پانچویں صدی میں مسلمانوں نے بند بنائے ہیں اور اسی طرح کتابخانوں اور علمی مراکز کی ترویج کے بارے میں بہت سے تاریخی شواہد ملتے ہیں۔ جس میں آل بویہ، فاطمی اور ہمدانی سلسلے نے بہت زیادہ دلچسپی لی ہے۔ بعض شیعہ حکومتوں میں شیعہ حکمرانوں نے ہسپتالوں میں مریضوں کے مفت علاج معالجے کا اہتمام کیا ہوا تھا اور صاحب علم وفن لوگوں کے لیے ماہانہ وظائف مقرر کیے ہوئے تھے۔ (۷)

اسلامی علوم کی پیشرفت میں شیعوں کا حصہ

اسلامی تہذیب وتمدن کی بنیادوں میں سے ایک اہم بنیاد مختلف علوم ومعارف ہیں کہ جن کی وجہ سے یہ تمدن دوسرے تمدنوں میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے چونکہ اسلام نے کسب علم کی بہت زیادہ تاکید کی ہے، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو تفسیر، فقہ، فلسفہ وکلام، حدیث وغیرہ خالص اسلامی علوم ہیں، ان میں مسلمانوں کی ترقی ہی کی وجہ سے اسلامی تمدن نے عروج حاصل کیا ہے۔ مذکورہ تمام علوم میں شیعہ سب سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ آئمہ اطہارؑ اور ان کے پیروکار شیعوں نے اسلامی علوم ومعارف کی پیش رفت میں نمایاں کارکردگی دکھائی ہے اس کا مختصر جائزہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

علم تفسیر

سب سے پہلے ہم علم تفسیر کو ہی لیتے ہیں۔ علم تفسیر ایک لحاظ سے اسلام سے پہلے بھی موجود تھا جیسا کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان کتب مقدس کی تفسیر کی جاتی تھی اور انھوں نے بھی اپنی آسمانی کتب کی شرحیں کی ہیں۔ اگرچہ یہ شرحیں مکتوب شکل میں نہیں تھیں البتہ ایک لحاظ سے ان کو بھی کتب مقدس کی تفسیر کہہ سکتے ہیں لیکن یہاں ہماری مراد قرآن کی تفسیر ہے۔ تفسیر قرآن میں بھی شیعہ سرفہرست ہیں۔ سب سے پہلے مفسر قرآن خود امیر المومنین علی علیہ السلام ہیں۔ آپؑ فرماتے ہیں:

"کوئی ایسی آیت نازل نہیں ہوئی کہ جس کا مجھے علم نہ ہو کہ کس کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور کہاں نازل ہوئی ہے۔ بتحقیق میرے اللہ نے مجھے قلب فہیم اور زبان گویا عطا فرمائی ہے۔" (۸)

اس بات کی تصریح کتب اہل سنت میں بھی ہوئی ہے۔ چنانچہ علامہ سیوطی لکھتے ہیں:

ولا احفظ عن ابی بکر رضی اللہ عنہ فی التفسیر الآثار القلیلۃ جدا لا تکاد تجاوز العشرہ و اما علی (رضی اللہ عنہ) فروی عنہ الکثیر و قد روی معمر عن وھب بن عبداللہ بن ابی الطفیل قال شھدت علیا یخطب و ھو یقول: سلونی فو اللہ لا تسالون عن شئی الا اخبر لکم و سلونی عن کتاب اللہ فو اللہ ما من آیۃ الا و انا اعلم ابلیل نزلت ام بنھار ام فی سھل ام فی جبل۔ (۹)

یعنی: ''اور مجھے تو ابو بکر رضی اللہ عنہ سے تفسیر قرآن کے متعلق بہت کم روایات دستیاب ہوسکی ہیں جن کی تعداد دس سے زیادہ نہیں۔ البتہ علی (رضی اللہ عنہ) سے اس بارے میں زیادہ روایات لی گئی ہیں۔ چنانچہ معمر نے وہب بن عبداللہ سے انھوں نے ابو طفیل سے روایت کی ہے کہ میں نے علی کو ایک خطا فرماتے سنا کہ پوچھ لو مجھ سے خدا کی قسم مجھ سے تم جس چیز کا سوال کروگے بتاؤں گا اور مجھ سے قرآن شریف کے متعلق پوچھو، پس اللہ کی قسم کوئی آیت ایسی نہیں جس کو میں نہ جانتا ہوں، خواہ رات میں اتری ہو یا دن میں زمین پر نازل ہوئی یا پہاڑ پر۔''

جیسا کہ کتب سیر و حدیث میں ہے کہ امام علی علیہ السلام کے بعد ان کے شاگرد اور عظیم مفسر حضرت ابن عباسؓ نے ایک تفسیر لکھی ہے کہ جو اس وقت بھی موجود ہے اور اہل سنت میں بھی ان کی تفسیر آراء کو قبول کرتے ہیں۔ ابن عباسؓ کی تفسیر کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ قرآن کے کلمات اور الفاظ کا معنیٰ کرتے وقت ایام جاہلیت کے اشعار سے بھی استفادہ کرتے ہیں اور تفسیر کے باب میں یہ بہت اہم چیز ہے۔ مثلاً آ نے قرآن کے ہر کلمہ کی وضاحت میں لکھا ہے کہ فلاں کلمہ امرؤ القیس کے فلاں شعر میں بھی آیا ہے اور وہاں اس کا یہ معنیٰ ہے۔ دوسرے بڑے مفسرین نے بھی ان کی تفسیر سے اقوال نقل کیے ہیں مثلاً طبری نے ان سے بہت سے اقوال نقل کیے ہیں۔

ابن عباسؓ کے بعد سعید بن جبیرؓ کہ جو مشہور شیعہ اور مفسر تھے جنھوں نے تفسیر لکھی ہے۔ ان کے بعد بھی ہر صدی میں شیعوں نے تفسیر قرآن پر خصوصی توجہ دی ہے اور شیعہ علماء نے بہت سی تفاسیر قرآن لکھی ہیں جن میں سے بعض چھپ چکی ہیں اور بعض خطی نسخوں کی صورت میں محفوظ ہیں۔ بہت سے متعصب لوگوں نے شیعوں پر عظیم ظلم کیا ہے اور لکھا ہے کہ شیعوں نے قرآن پر کوئی توجہ نہیں دی حالانکہ شیعہ تفاسیر کی تعداد اہل سنت تفاسیر سے کہیں زیادہ ہے۔

علم فقہ اور حدیث

فقہ کے بارے میں بھی دیکھا جائے تو شیعہ دوسرے اسلامی فرقوں کی نسبت بہت زیادہ توفیقات سے بہرہ مند ہیں۔ ائمہ اطہار بالخصوص امام باقرؑ اور امام جعفر صادق علیہم السلام نے فقہ اہل بیتؑ کو مدون کرنے میں بہت زیادہ کوششیں کی ہیں۔ البتہ فقہ فقط علم عقلی ہی نہیں بلکہ اس میں ہم منقولات کے زیادہ محتاج ہیں۔ شیعہ مکتب کی خوش نصیبی ہے عقیدہ امامت کی بدولت انھی رسول اکرمؐ سے متصل کرنے والے سلسلہ عصمت و طہارت کی وجہ سے منقولات کا ایک وسیع ذخیرہ ملا ہے۔

نبی اکرمؐ کے بعد ان کی علمی اور روحانی وراثت کے امین بارہ ائمہ معصومینؑ نے شیعوں کے لیے زندگی کے ہر شعبے سے متعلق احادیث اور روایات کا ایک وافر ذخیرہ چھوڑا ہے، اس لیے شیعہ مکتب کے پاس فقہی احادیث کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہونے کی وجہ سے وہ ہر موضوع پر شرعی احکام کا استنباط کر سکتے ہیں اور پھر شیعوں نے دروازہ اجتہاد بھی بند نہیں کیا جس کی وجہ سے ہر دور میں

مجتہدین موجود رہے ہیں اور جدید سے جدید مسائل کے حل کے لیے احکام استنباط ہوتے رہے ہیں۔افسوس کے ساتھ اہل سنت کے پاس اس قسم کے فقہی منابع نہیں چونکہ وہ فقط احادیث نبوی پر اکتفا کرتے ہیں جن کی تعداد شیعہ احادیث کی نسبت بہت کم ہے۔جس کی وجہ سے اہل سنت کے آئمہ فقہ کو قیاس اور استحسان جیسے ذرائع کا محتاج ہونا پڑا ہے جو ہمارے نزدیک یقین آور نہیں ہے۔شیعہ مکتب فکر کے مطابق جو احادیث آئمہ معصومین علیہم السلام کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں، ان کا سلسلہ روایت خود پیغمبر اکرمؐ تک پہنچتا ہے جو یقینی ترین سلسلہ سند ہے۔

بنابریں شیعوں کے پاس علم فقہ میں ایک عظیم سرمایہ موجود ہے جس کی بدولت وہ ایک ترقی یافتہ فقہ کی پیروی کرتے ہیں اور زمان ومکان کے لحاظ سے فقہی احکام میں انھیں کوئی مشکل پیش نہیں آتی اور وہ باب اجتہاد کے کھلا ہونے کی وجہ سے جدید زمانے کے تقاضوں کے مطابق شرعی زندگی گزار سکتے ہیں۔اسی طرح شیعہ فقہ میں جدید تمدن کے پیدا شدہ تمام سوالات کا جواب موجود ہے۔

اہل سنت کے ہاں ایک عرصہ دراز تک حدیث کی کتابت پر پابندی تھی۔کہتے ہیں یہ پابندی عمر بن عبدالعزیز کی حکومت تک باقی رہی ہے، لیکن شیعہ نے اس پابندی کو قبول نہیں کیا جس کی وجہ سے دوسروں کی نسبت شیعہ مکتب، پیغمبر اکرمؐ کی احادیث، فرامین اور سیرت کی حفاظت کرنے میں بہت کامیاب رہا ہے۔جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ علم تفسیر کے علاوہ علم فقہ میں بھی شیعہ اہل سنت پر مقدم ہیں۔قرآن مجید کہ جو وحی الٰہی ہے کے بعد سب سے پہلا فقہی مجموعہ حضرت امام علی علیہ السلام نے تدوین کیا تھا اور وہ ایک ایسا صحیفہ تھا جسکو آپؑ نے ایک جلد کی شکل میں اپنی تلوار کے ساتھ باندھا ہوتا تھا۔آپؑ سے منقول ہے کہ ہمارے پاس قرآن کے بعد اس صحیفہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔اس صحیفہ میں دیات تک کے مسائل موجود تھے۔(۱۰)

بعض منابع کے مطابق حضرت امام علی علیہ السلام کے بعد سب سے پہلا فقہی مجموعہ ابو رافع نے ''السنن والاحکام والقضایا'' کے نام سے تالیف کیا۔ابو رافع امام علی علیہ السلام کا کاتب اور منشی تھا۔(۱۱) ان منابع کے مطابق شیعہ علم فقہ میں بھی دوسرے فرقوں پر مقدم ہیں۔کتابت حدیث کی ممنوعیت کہ جو تقریباً ایک سو سال تک رہی ہے، اس دوران بہت سے محدثین دنیا سے رخصت ہو گئے تھے جس کی وجہ سے وضعی احادیث کا دروازہ کھل گیا تھا اور اس سے مسلمانوں کا عظیم علمی نقصان ہوا ہے لیکن یہ نقصان زیادہ تر اہل سنت ہی کا ہوا ہے، کیونکہ شیعہ، حکمرانوں کی طرف سے کتابت حدیث پر پابندی، کے پابند نہیں تھے۔اس کے بعد امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام کے دور میں ان دونوں ائمہ کے مکتب میں ایسے شاگرد پرورش پانے لگے کہ جن میں سے ہر ایک نے بہت زیادہ احادیث حفظ کرلی تھیں۔بعض نے تیس ہزار اور بعض نے بیس ہزار احادیث ان شاگردوں میں محمد بن مسلم، زرارۃ بن اعین اور جابر بن یزید جعفی کا نام قابل ذکر ہے۔(۱۲)

ان احادیث کا مجموعہ بعد میں شیعوں کے اصول ''اربع مئہ'' کی صورت میں ظاہر ہوا، جو چار سو اصولوں پر مشتمل تھا۔اصل سے مراد احادیث کا وہ مجموعہ ہے جو راوی نے براہ راست یا ایک واسطے کے ذریعے معصوم سے نقل کیا ہے۔اصول ''اربع مئہ'' ہی شیعوں کی کتب اربعہ کی بنیاد ہیں۔شیعہ شروع ہی سے ممنوعیت حدیث کی تحریک کے مخالف تھے اور اسے ایک قسم کی گمراہی اور سازش قرار دیتے تھے، لہٰذا وہ کسی بھی وقت اس حکم کے پابند نہیں رہے اور ہر زمانے میں اپنی فقہی اصالت کی حفاظت کرتے رہے۔

اسلامی تمدن اور تحریک ترجمہ

فتوحات کے بعد اسلامی تمدن کا جغرافیا بہت پھیل جانے اور دوسری تہذیبوں کے ساتھ میل جول کی وجہ سے اسلامی تہذیب و

تمدن نے جو اثرات قبول کیے ہیں ان میں سے ایک دوسری زبانوں سے علمی کتابوں کے علمی میں ترجمہ کرنے کی تحریک تھی۔ جس کی مختلف علل واسباب ذکر کیے جاتے ہیں۔ دوسری زبانوں سے عربی میں ترجمے کا آغاز خالد بن یزید کے زمانے میں ہوا ہے، وہ پہلا شخص تھا جس نے ریاضی کی چند کتابوں کو عربی میں ترجمہ کیا ہے لیکن ترجمے کی باقاعدہ تحریک عباسیوں کے زمانے میں شروع ہوئی ہے۔ جس میں فلسفہ، طب، ریاضی، نجوم حتیٰ امور مملکت کے بارے میں متعدد کتابوں کے ترجمے ہوئے ہیں۔

یہ تحریک مامون عباسی کے دور میں اپنے عروج کو پہنچ گئی تھی۔ اس نے "بیت الحکمہ" کے نام سے ایک مرکز بنایا تھا اور بہت سے افراد کو دنیا کے مختلف ممالک کی طرف بھیجا تاکہ وہ مختلف علوم وفنون کی کتابیں تلاش کرکے لائیں اور ان کا عربی ترجمہ کیا جائے۔ عباسی خلفا خصوصاً مامون کی تشویق پر بہت سی کتابیں ترجمہ کی گئیں۔ مامون ترجمہ کرنے والوں کو کتاب کے ہم وزن سونا اجرت میں دیتا تھا۔ لہٰذا جو بھی کتاب اسلامی ملک میں لائی جاتی، اس کے ترجمے کی ضرورت نہ ہونے کے باوجود اس کا ترجمہ کردیا جاتا تھا۔

یہ کتابیں اکثر یونان، روم، ہندوستان اور ایران سے لائی گئیں تھیں۔ ترجمے کی یہ تحریک تقریباً صدی تک جاری رہی۔ اس دوران مسلمان اپنی تخلیقات کے بجائے دوسرے کے مترجم بن چکے تھے۔ ایک رائے کے مطابق لوگوں کے افکار میں رشد وترقی پیدا ہو چکی تھی اور وہ حقائق جاننا چاہتے تھے۔ عقلی اور فکری مسائل کے مترجم بن چکے تھے۔ ایک رائے کے مطابق لوگوں کے افکار میں رشد وترقی پیدا ہو چکی تھی اور وہ حقائق جاننا چاہتے تھے۔ عقلی اور فکری مسائل کی یہی پیاس انھیں آئمہ اہل بیتؑ کی طرف لے جاسکتی تھی جن کے علم وفضل سے تمام لوگ آگاہ تھے لیکن خلفا اس مسئلے سے خائف تھے اور وہ آئمہ اطہار علیہم السلام کے علم وفضل سے عامۃ الناس کو دور رکھنا چاہتے تھے، لہٰذا اس خوف کی وجہ سے انھوں نے دوسری زبانوں سے علمی کتابوں خصوصاً فلسفی کتب کے ترجمے کی تشویق کی تاکہ لوگوں کی علمی اور فکری پیاس کا رخ موڑا جاسکے اور لوگ علم ومعرفت کے بہانے اہل بیتؑ اطہار کی جانب رجوع نہ کریں۔ دوسری جانب یہ کام خلفائے بنی عباس کی علم دوستی کا ڈھنڈورا پیٹنے کے لیے بھی انجام پارہا تھا اور ایک تیر سے دو شکار کیے جارہے تھے۔

اسی سیاست کی وجہ سے بنی عباس بہت حد تک لوگوں کو اہل بیت اطہارؑ سے دور رکھنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ چونکہ لوگوں کی علمی پیاس اور حقیقت طلبی کی پیاس کو دوسرے علوم وفنون سے بجھایا جانے لگا تھا۔ بظاہر اس کام کے دنیائے اسلام پر کچھ مثبت اثرات بھی مرتب ہوئے تھے، لیکن منفی اثرات بھی کم نہیں تھے۔ اس سلسلے میں آئمہ اطہار علیہم السلام کی جانب سے تحریک ترجمہ کے منفی اثرات کو ختم کرنے کے لیے جو کچھ انجام پایا ہے وہ بہت اہم ہے۔ آئمہ اطہارؑ کی ہدایت اور رہنمائی کے سبب شیعہ ان حالات سے متاثر نہیں ہوئے اور انھوں نے اہل بیت اطہارؑ کی علمی مرجعیت کا دامن کبھی بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور تمام تر علمی کتب کے ترجمے کے باوجود آئمہ معصومینؑ کے علم سے استفادہ کرتے رہے چونکہ ان کو یقین کامل تھا کہ ان ذوات مقدسہ کے علم کا سرچشمہ علم نبوی اور وحی الٰہی ہے اور یہ علم لدنی کی حامل ہستیاں ہیں۔

لہٰذا ترجمہ شدہ علمی کتابیں ان کے علم کا ہرگز مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ شیعہ ہر علمی مسئلے کے بارے میں آئمہ اطہارؑ سے سوالات پوچھتے تھے اور تمام علمی، عقیدتی، فقہی اور سیاسی واجتماعی مسائل کے حل کے لیے انہی ہستیوں کی طرف رجوع کرتے تھے، انہی سوالات کی برکت سے آئمہ اطہار کی احادیث نے گمراہ کن افکار کا راستہ روکا اور تحریک ترجمہ کی وجہ سے پیدا ہونے والے شبہات و سوالات کے منفی اثرات سے اسلامی معاشرے کو نہ فقط بچایا بلکہ ان کے گمراہ عقائد ونظریات کا مقابلہ بھی کیا لیکن یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ آئمہ معصومین علیہم السلام، علم کے مخالف نہیں تھے۔ یعنی جو کچھ ترجمے کے ذریعے باہر سے وارد کیا جارہا تھا وہ ان سب

چیزوں کے مخالف نہیں تھے۔ بطور مثال ایک روایت کے مطابق امام جعفر صادق علیہ السلام نے "ارسطاطالیس" کی تعریف کی ہے اور اسے موحد قرار دیا ہے۔ یہ بات توحید مفضل کی حدیث کے آخر میں نقل ہوئی ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ ائمہ اطہار علیہم السلام زمین پر حجت خدا تھے اور معاشرے کی ہدایت کی ذمہ داری ان کے دوش مبارک پر تھی۔ بہت سے موقعوں پر انھوں نے لوگوں حتی حکام وقت کی ہدایت کا فریضہ انجام دیا تھا اور تمام گمراہ عقائد اور توحید کے خلاف نظریات کی انھوں نے نفی فرمائی ہے اور لوگوں کو ان گمراہ کو نظریات سے بچانے کی سعی کی ہے۔ تحریک ترجمہ بھی انھوں نے اپنے اسی فریضے پر عمل کیا ہے اور ترجمے کے منفی اثرات سے اسلامی معاشرے کو محفوظ رکھا ہے۔ اسلامی معاشرے کو افراط و تفریط سے بچانے کے لیے ائمہ اطہار نے جو اقدامات کیے ہیں ان کی ایک مثال مکتب اعتزال کا مقابلہ تھا۔

معتزلہ عقل کو حد سے زیادہ اہمیت دیتے تھے اور ہر چیز کا معیار وہ عقل کو قرار دیتے تھے۔ اس دوران یونانی فلسفے نے بھی مکتب اعتزال کی بہت زیادہ حوصلہ افزائی کی ہے لیکن اس کے مقابلے میں ائمہ طاہرین کی سعی تھی کہ وہ مسلمانوں کو محدود عقل پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کرنے سے منع کریں۔ اس دوران جو افکار و نظریات بیرونی دنیا سے اسلامی معاشروں میں داخل ہو رہے تھے وہ مکتب اعتزال کو رائج کرنے میں بہت زیادہ مدد و معاون ثابت ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ فلسفہ مامون خود مکتب اعتزال کے افکار اپنا چکا تھا۔ عقل پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کرنے کے سلسلے میں معتزلہ کے افراطی رویے کے مقابلے میں اہل حدیث اٹھ کھڑے ہوئے تھے جو مسائل کو سمجھنے میں عقل کی مکمل نفی کر رہے تھے اور فقط نقل پر بھروسہ کرنے کو اہمیت دیتے تھے۔ یہ رویہ تفریط پر مبنی تھا۔ ائمہ طاہرین نے اس دوران افراط و تفریط پر چلنے والے ان دونوں گروہوں کی نفی اور انھیں راہ اعتدال اختیار کرنے تلقین کرتے ہوئے اسلامی معاشرے کو ایک بڑی گمراہی سے بچایا۔

اس زمانے میں معتزلہ کے علاوہ کچھ لوگ زندیق اور دہری ناموں کے ساتھ عقیدتی گمراہی پھیلانے لگے تھے۔ امام باقر اور امام جعفر صادق علیہم السلام نے ان دونوں کے ساتھ بھی طولانی مناظرے کیے جو ہماری تاریخ میں ثبت ہیں۔ اس زمانے میں ایک گمراہ گروہ نے دینی عقائد و معارف کے سلسلے میں التقاط کی نفی کر کے ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھنی شروع کردی، دوسرے الفاظ میں جو کچھ دین میں سے ان کا من پسند تھا اسے لے لیا اور جو کچھ ان کو پسند نہیں تھا اسے چھوڑ دیا جاتا تھا۔

اسی طرح کچھ من پسند عقائد ایک دین و مذہب اٹھائے جاتے اور کچھ دین اسلام سے لے لیا جاتا۔ اسے فارسی اور عربی اصطلاح میں التقاط گری کہا جاتا ہے جو آج بھی بعض روشن خیال گروہوں میں موجود ہے۔ یہ چیز اسلامی تہذیب و تمدن کو خراب کرنے میں بہت بڑا کردار ادا کرسکتی ہے اور اس سے اسلامی عقائد کا چہرہ بگڑ سکتا ہے۔ اس چیز کے خلاف آئمہ اہل بیت علیہم السلام نے بہت زیادہ جہاد کیا اور علمی مناظروں کے ذریعے ایسے گروہوں کو شکست دے کر ان کی اسلامی معاشرے میں حوصلہ شکنی کی اور اسلامی معاشرے کو اس قسم کے خطرات سے محفوظ رکھا۔ یہ کام فقط آئمہ اہل بیتؑ ہی کرسکتے تھے چونکہ یونانی فلسفے اور دوسرے عقائد کے ترجمے کی وجہ سے بہت سے علمی مغالطات پیدا ہو رہے تھے جو نوخیز اسلامی تہذیب کے لیے بہت سخت خطرہ بن چکے تھے۔ خلفائے بنی عباس تو اس زعم میں مبتلا تھے کہ ہم علم و ادب کی خدمت کر رہے ہیں لیکن انھیں معلوم نہیں تھا کہ ان کے اس عمل کی وجہ سے مسلمانوں میں کس کس قسم کے شکوک و شبہات پیدا ہو رہے ہیں اور دینی عقائد کن خطرات سے دوچار ہو چکے ہیں۔ یہ اہل بیت اطہار کا علم و فضل ہی تھا جو اسلامی معاشروں کو اس قسم کے شبہات سے بچا سکتا تھا۔

چنانچہ مامون عباسی کے دور میں امام رضا علیہ السلام نے مرو اور خراسان میں بہت سے ایسے ہی زندیق اور دہریے

گروہوں کے ساتھ علمی مناظرات کر کے ان کے پیدا کیے ہوئے شکوک وشبہات اور مغالطوں کا ازالہ کیا۔ یہ درست ہے کہ یہ مناظرے مامون عباسی منعقد کراتا تھا لیکن اس سے وہ اپنے سیاسی مفادات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ایک تو وہ اس طرح کے مناظروں کے ذریعے لوگوں کو مشغول رکھنا چاہتا تھا تاکہ وہ اس کی اسلامی مملکت کے بارے میں سیاسی خامیوں کی طرف متوجہ نہ ہوسکیں۔ دوسرا وہ ان مناظروں کے ذریعے خود کو علم وادب کا مروج ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ ان مناظروں میں فلاسفہ، زنادقہ، صائبین اور عیسائی گروہ شرکت کرتے تھے جن کی وجہ سے مامون کو یہ امید بھی ہوتی تھی کہ کسی موقع پر امام رضا علیہ السلام سے ان گرہوں کے مقابلے میں علمی کمزوری ظاہر ہوجائے تو بھی وہ اس سے سیاسی مفاد حاصل کرسکے۔ البتہ آئمہ اطہارؑ کے یہ علمی مناظرے تاریخ مسلمین کا ایک عظیم سرمایہ ہیں لیکن تعصب اور اہل بیت دشمنی کی وجہ سے یہ چیزیں تاریخ کے صفحات میں دب کر رہ گئی ہیں۔

ایک اور اہم نکتہ یہ کہ رحلت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بہت سے اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) مدینہ آنے شروع ہو گئے تھے تاکہ مسلمانوں کے ساتھ مناظرے کریں لیکن خلفائے اول اور دوم اس قسم کے مناظروں پر قادر نہیں تھے لہٰذا ایسے موقعوں پر جب حضرت امام علی علیہ السلام کو خبر ہوتی اور وہ دین اسلام کو علمی میدان میں خطرات میں دیکھتے تو ان مناظروں میں حاضر ہو کر اہل کتاب کے شبہات وسوالات کا جواب دیتے۔ بعض اوقات خود خلفاء حضرت امام علی علیہ السلام کو بلاتے تھے کہ وہ ان کی مشکل کشائی کریں۔ بہت سی کتب حدیث میں آیا ہے کہ حضرت رسول اکرمؐ نے فرمایا: ''اقضاکم علیؑ'' یعنی تم میں قضاوت کے لحاظ سے سب سے زیادہ توانا علی ہیں۔ (۱۳) چونکہ قاضی کو فقیہ بھی ہونا چاہیے لہٰذا اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت امام علی علیہ السلام سب سے بڑے فقیہ بھی تھے۔ حضرت امام علی علیہ السلام نہ فقط علمی وفقہی مسائل میں بلکہ کسی تہذیب وتمدن کی تشکیل میں ضروری تمام دوسرے شعبوں میں بھی سرفہرست ہیں۔

عسکری اور فوجی مسائل ہوں یا سیاسی مسائل ان میں بھی حضرت امام علی علیہ السلام اور دوسرے آئمہ طاہرینؑ نے اقتدار سے باہر رہ کر بھی اسلامی مملکت کی بے مثال خدمات انجام دی ہیں۔ خلفائے وقت کو جب بھی اسلامی معاشرے کی بنیادیں ہلتی ہوئی نظر آئی ہیں، انھوں نے اہل بیت اطہارؑ کو اپنی تمام تر دشمنی کے باوجود مدد کے لیے پکارا ہے۔ چنانچہ حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کے زمانے کا واقعہ ہے کہ جب امام علیہ السلام حکومتی زندان میں تھے، ملک میں قحط شروع ہوگیا اور بارشیں بند ہوگئیں۔ مسلمان جس قدر نماز استسقاء پڑھتے تھے بارش نہیں ہوتی تھی۔ اس وقت ایک عیسائی پادری میدان میں اترا اور اس نے اسلامی معاشرے کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا اور مسلمانوں کے اعتقادات کی بنیادیں کمزور کرنی شروع کردی۔ یہ پادری میدان میں آیا اور اس کی دعا سے بارش شروع ہوگئی۔

اس موقع پر خلیفہ وقت نے مجبوراً امام حسن عسکری علیہ السلام سے مدد طلب کی۔ امام علیہ السلام کو قید خانے سے آزاد کیا گیا۔ امام علیہ السلام نے حکم دیا وہ عیسائی دوبارہ بارش کی دعا کے لیے اکٹھے ہوں۔ مقررہ وقت پر مسلمان اور عیسائی سب اکٹھے ہوئے۔ عیسائی پادری جب دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے تو امام علیہ السلام نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے ہاتھ میں موجود ایک ہڈی لے لی اور فرمایا: یہ ایک نبی خدا (علیہ السلام) کی ہڈی ہے اور جب بھی کسی نبی خدا کی ہڈی آسمان کے نیچے ظاہر ہوتی ہے تو بارش شروع ہوجاتی ہے۔ یہ شخص اسی ہڈی سے فائدہ اٹھا رہا تھا اور اسکی برکت سے بارش برس رہی تھی۔ اس طرح امام علیہ السلام نے اسلامی معاشرے کو ایک بڑے شبہے سے نجات دلائی اور اسلامی معاشرے کی بنیادوں کو محفوظ کردیا۔ (۱۴)

آئمہ اطہار علیہم السلام کے وسیلے سے اسلامی معاشرے کو علمی اور دینی شبہات سے بچانے کا ایک اور مشہور واقعہ وہ ہے۔ جو

اسحاق کندی کے ساتھ منسوب ہے۔ مورخین کا بیان ہے کہ عراق کے ایک عظیم فلسفی اسحاق کندی کو یہ خبط سوار ہوا کہ قرآن مجید میں تناقض ثابت کرے اور یہ بتادے کہ قرآن مجید کی ایک آیت دوسری آیت سے اور ایک مضمون دوسرے مضمون سے ٹکراتا ہے اس نے اس مقصد کی تکمیل کے لیے "تناقضات القرآن" نام کی ایک کتاب لکھنا شروع کی اور اس درجہ منہمک ہو گیا کہ لوگوں سے ملنا جلنا اور کہیں آنا جانا سب ترک کر دیا۔ حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اس کے خبط کو دور کرنے کا ارادہ فرمایا، آپ کا خیال تھا کہ اس پر کوئی ایسا اعتراض کر دیا جائے کہ جس کا وہ جواب نہ دے سکے اور مجبوراً اپنے ارادہ سے باز آ ئے۔

اتفاقاً ایک دن آپ کی خدمت میں اس کا ایک شاگرد حاضر ہوا، حضرت نے اس سے فرمایا کہ میں تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو اسحاق کندی کو "تناقض القرآن" لکھنے سے باز رکھے۔ اس نے عرض کی مولا! میں اس کا شاگرد ہوں، بھلا اس کے سامنے لب کشائی کر سکتا ہوں، آپ نے فرمایا کہ اچھا یہ تو کر سکتے ہو کہ میں جو کہوں وہ اس تک پہنچا دو، اس نے کہا کر سکتا ہوں، حضرت نے فرمایا کہ پہلے تو تم اس سے موانست پیدا کرو اور اس پر اعتبار جماؤ جب وہ تم سے مانوس ہو جائے اور تمھاری بات توجہ سے سننے لگے تو اس سے کہنا کہ مجھے ایک شبہ پیدا ہو گیا ہے آپ اس کو دور فرما دیں، جب وہ کہیں کہ بیان کرو تو کہنا کہ:

ان اتاک هذا المتکلم بهذا القرآن هل یجوز مراده بما تکلم منه عن المعانی التی قد ظننتها انک ذهبتها الیها۔

یعنی: اگر اس کتاب یعنی قرآن کا مالک تمھارے پاس اسے لائے تو کیا ہو سکتا ہے کہ اس کلام سے جو مطلب اس کا ہو، وہ تمھارے سمجھے ہوئے معانی و مطالب کے خلاف ہو۔

جب وہ تمھارا یہ اعتراض سنے گا تو چونکہ ذہین آدمی ہے فوراً کہے گا کہ بے شک ایسا ہو سکتا ہے جب وہ یہ کہے تو تم اس سے کہنا کہ پھر کتاب "تناقض القرآن" لکھنے سے کیا فائدہ؟ کیونکہ تم اس کے جو معنی سمجھ کر اس پر اعتراض کر رہے ہو، ہو سکتا ہے کہ وہ خدائی مقصود کے خلاف ہو، ایسی صورت میں تمھاری محنت ضائع اور برباد ہو جائے گی کیونکہ تناقض تو جب ہو سکتا ہے کہ تمھارا سمجھا ہوا مطلب صحیح اور مقصود خداوندی کے مطابق ہو اور ایسا یقینی طور پر نہیں تو تناقض کہاں رہا؟

الغرض وہ شاگرد، اسحاق کندی کے پاس گیا اور اس نے امامؑ کے بتائے ہوئے اصول پر اس سے مذکورہ سوال کیا اسحاق کندی یہ اعتراض سن کر حیران رہ گیا اور کہنے لگا کہ پھر سوال کو دہراؤ اس نے پھر اعادہ کیا۔ اسحاق تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا اور کہنے لگا کہ بے شک اس قسم کا احتمال باعتبار لغت اور بلحاظ فکر و تدبر ممکن ہے۔ پھر اپنے شاگرد کی طرف متوجہ ہو کر بولا! میں تمھیں قسم دیتا ہوں تم مجھے صحیح صحیح بتاؤ کہ یہ اعتراض کس نے بتایا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میرے شفیق استاد یہ میرے ہی ذہن کی پیداوار ہے۔ اسحاق نے کہا ہرگز نہیں، یہ تمھارے جیسے شخص کے بس کی چیز نہیں ہے، تم سچ بتاؤ کہ تمھیں کس نے بتایا اور اس اعتراض کی طرف کس نے رہنمائی کی ہے۔ شاگرد نے کہا کہ سچ تو یہ ہے کہ مجھے حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام نے فرمایا تھا اور میں نے انھیں کے بتائے ہوئے اصول پر آپ سے سوال کیا ہے۔ اسحاق کندی بولا: اب تم نے سچ کہا ہے، ایسے اعتراضات اور ایسی اہم باتیں خاندان رسالت ہی سے برآمد ہو سکتی ہیں۔

ثم انه دعا بالنار و احرق جمیع ما کان الفه

پھر اس نے آگ منگوائی اور کتاب تناقض القرآن کا سارا مسودہ نذر آتش کر دیا۔ (۱۵)

ان تاریخی شواہد سے واضح ہوتا ہے کہ اگر اسلامی معاشرے کو علمی لحاظ سے حضرت علیؑ اور دوسرے آئمہ علیہم السلام جیسی مضبوط

ہستیوں کی پشت پناہی حاصل نہ ہوتی تو وہ دین اسلام بہت سی مشکلات اور شبہات کا شکار ہو جاتا اور اسلامی تہذیب وتمدن کی بنیادیں شروع سے ہی کمزور ہو جاتیں، لیکن آئمہ طاہرینؑ کے وجود کی برکت سے مسلمان اسلامی تہذیب وتمدن کی مضبوط بنادیں بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ چونکہ یہ بات سب پر واضح ہے کہ علمی بنیادوں کے بغیر کوئی بھی تہذیب وتمدن عرصہ دراز تک قائم نہیں رہ سکتا۔

اخلاق اور عرفان

علم اخلاق اور عرفان جیسے شعبوں میں بھی دیکھیں تو شیعہ معارف اور علوم کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نظر آتا ہے۔ آئمہ طاہرین علیہم السلام کی احادیث اور روایات میں اخلاقی اور عرفانی احادیث کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے لیکن آئمہ طاہرینؑ نے ہمیشہ مخاطبین کی علمی اور فکری سطح کے مطابق احادیث بیان فرمائی ہیں۔ بعض فرامین آئمہ عام لوگوں کی سطح علمی وفکری کے مطابق ہیں اور بعض احادیث خواص اور گہرے ادراک کے حامل اصحاب کے سامنے بیان فرمائی گئی ہیں۔ مثلاً جو احادیث امام علی علیہ السلام نے کمیل کو مخاطب کرکے یا امام جعفر صادق علیہ السلام نے عنوان بصری کو مخاطب کرکے بیان فرمائی ہیں ان کی علمی سطح بہت بلند ہے۔

یہی احادیث عرفان شیعہ کی بنیاد بنتی ہیں۔ آئمہ طاہرین علیہم السلام کے شاگردوں نے بھی آئمہ طاہرین کے فرامین کی روشنی میں بہت سی کتب اخلاق تالیف کی ہیں۔ نجاشی نے اپنی فہرست میں بہت سی ایسی کتابوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اگر کوئی محقق فہرست نجاشی، فہرست شیخ منتجب الدین، ابن ندیم، فہرست شیخ طوسی اور معالم العلماء جیسی کتب فہرست کی طرف رجوع کرے تو اسے پتا چل جائے گا کہ شیعوں نے اس شعبے میں کس قدر کام کیا ہے اور اسلامی تہذیب وتمدن کو اخلاق اور عرفانی حوالے سے کس قدر بے نیاز کر دیا ہے۔ اسی طرح بعض شیعہ فلاسفہ اور عرفاء نے بھی علم اخلاق وعرفان میں حیرت انگیز کتابیں تحریر کی ہیں۔ جن میں ابن مسکویہ کی ''طہارۃ الاخلاق'' قابل ذکر ہے جو علم اخلاق کے مشہور ترین منابع میں شمار ہوتی ہے۔ خواجہ نصرالدین طوسی کی کتاب ''اخلاق ناصری'' کا مقام بھی سب پر روشن ہے۔ اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر افتخار حسین لکھتے ہیں:

''اخلاقیات میں طوسی کی کتاب'' ''اخلاق ناصری'' ''ارسطو کی'' ''اخلاقیات'' کے بعد سے اہم کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔(۱۶)

اصطلاحاً اخلاق کو ''حکمت عملی'' اور ''حکمت نظری'' کہا جاتا ہے، شیعہ اہل بیت اطہارؑ سے میراث میں ملنے والی انہی احادیث کی وجہ سے عملی طور پر مہذب تھے۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو شیعوں کا پہلا اخلاقی دستور العمل امام علی علیہ السلام کا وہی مکتوب ہے جو آپؑ نے جنگ صفین سے واپسی پر ''حاضرین'' کے مقام پر اپنے فرزند ارجمند حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے نام لکھا تھا۔ (نہج البلاغہ، مکتوب نمبر ۳۱، صبحی صالح) اسے تاریخ اسلام میں پہلے اخلاقی رسالہ کہا جاتا ہے۔ اس مکتوب میں امیر المومنین علیہ السلام نے علم اخلاق کے تمام ابواب اور سیر وسلوک کے تمام طریقوں کو بیان فرمایا ہے اور ملکات فاضلہ کی نشاندہی کی ہے۔

اسلامی تہذیب وثقافت میں شاہکار علمی وادبی کتابوں میں ایک نہج البلاغہ ہے جو امام علی علیہ السلام کے خطبات، مکتوبات اور کلمات قصار کا مجموعہ ہے جو مسلمانوں کی علمی وادبی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ یہ کتاب معروف شیعہ عالم سید رضیؒ نے جمع کی ہے جس میں مولا علی علیہ السلام کے فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے شاہکار کلام کو جمع کیا گیا ہے۔

دعا ومناجات کے باب میں بھی امام زین العابدین علیہ السلام کی ''صحیفہ کاملہ'' ایک ایسی شاہکار کتاب ہے جس کی وجہ سے اسلامی تہذیب وتمدن جس قدر فخر کرے کم ہے چونکہ دعا اور مناجات کے سلسلے میں اس سے اہم اور بڑا مجموعہ کہیں اور نہیں ملتا۔ کتاب

صحیفہ کاملہ آپؑ کی دعاؤں کا مجموعہ ہے اس میں بے شمار علوم وفنون کے جوہر موجود ہیں یہ پہلی صدی کی تصنیف ہے۔(۱۷) اسے علماء اسلام نے زبور آل محمد اور انجیل اہل بیت کہا ہے (ینابیع المودۃ ص، ۴۹۹، فہرست کتب خانہ طہران، ص ۳۶) اور اسکی فصاحت و بلاغت معانی کو دیکھ کر اسے کتب سماویہ اور صحف الٰہیہ وعرشیہ کا درجہ دیا گیا ہے (ریاض السالکین ص ۱) اس کی چالیس شرحیں ہیں جن میں ریاض السالکین کو فوقیت حاصل ہے۔

اس کے علاوہ شیعہ علماء نے اخلاقیات اور عرفانیات کے باب میں اہم آثار چھوڑے ہیں ان میں اصول کافی ثقۃ الاسلام کلینی، تحف العقول ابن شعبہ حرانی، الخصال شیخ صدوق، مصابیح القلوب ابو علی بیہقی شیعی، الاداب الدینیہ شیخ طبرسی، مکارم الاخلاق شیخ ابو منصور طبرسی، ارشاد القلوب دیلمی، عون الحکم والمواعظ شیخ علی بن محمد لیثی واسطی، تنبیہ الخواطر شیخ ابو الحسن ورام، وسائل الشیعہ شیخ حر عاملی (کتاب العشرہ)، بحار الانوار مجلسی (جلد ۷۶، ۷۷، ۶۹) وسراج الشیعہ فی آداب الشریعہ شیخ عبداللہ مامقانی ایسی اخلاقی کتابیں ہیں جو آئمہ اطہار ہی کی پیروی میں لکھی گئی ہیں۔(۱۸)

یہ انہی کتب کا اثر تھا کہ جہاں جہاں شیعہ نے اپنے اسلاف کے علوم ومعارف سے کی حفاظت کی ہے اور علم سے تمسک رکھا ہے، ان پر اسلامی اخلاق وعرفان حاکم رہا ہے۔ بعض تاریخی شواہد سے پتا چلتا ہے کہ شیعہ اپنے اپنے علاقوں میں انہی کتابوں کی وجہ سے پابند شریعت رہے ہی اور اخلاقی اعتبار سے بھی انتہائی مہذب اور دوسروں سے ممتاز زندگی گزارتے رہے ہیں۔ قزوینی اپنی کتاب آثار البلاد واخبار العبد میں لکھتا ہے کہ مدائن کے لوگ شیعہ امامیہ ہیں ان کے شہر میں عورتیں دن کے وقت بازاروں میں نہیں آتیں۔

فلسفہ وکلام

علم کلام کا تعلق اسلامی عقائد سے ہے جس کی تعریف میں کہا جاتا ہے یہ ایسا علم ہے جس کے ذریعے اسلام کے مختلف پہلوؤں کا دفاع کیا جاتا ہے۔ یعنی اس کے ذریعے انسان میں اسلامی اعتقادات کا دفاع کرنے اور اسلام کے بارے میں شبہات کا جواب دینے کی قدرت پیدا ہوتی ہے۔ علم کلام کا تعلق اعتقادات (معرفت خدا، نبوت وغیرہ) سے ہے، اس لیے آئمہ اطہار علیہم السلام کے زمانے میں شیعوں کو اس لحاظ سے کوئی مشکل نہیں تھی چونکہ وہ اپنے اعتقادی مسائل براہ راست آئمہ اطہارؑ سے سیکھ لیتے تھے یا جن علاقوں میں آئمہ نہیں تھے وہاں آئمہ اطہارؑ کے شاگرد شیعوں کے کلامی واعتقادی سوالات کے جواب دیتے تھے۔ گمراہ کن عقائد کا مقابلہ کرنے اور مختلف مذاہب اور ادیان کے پیروکاروں کے ساتھ بحث ومباحثہ کرنے کے سلسلے میں بھی آئمہ اطہارؑ اور ان کے پروردہ شاگرد پیش قدم تھے۔ آئمہ اطہارؑ نے تمام مسالک اور مذاہب کے ساتھ جو مناظرے اور علمی مباحثے کیے ہیں وہ تاریخ میں محفوظ ہیں۔ جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کا ابن ابی العوجاء کے ساتھ مناظرہ اور امام رضا علیہ السلام کا مختلف ادیان کے علماء کے ساتھ بحث ومباحثہ قابل ذکر ہے۔ آئمہ اہل بیتؑ اور ان کے پرورش یافتہ شاگردوں کا یہی علمی کارنامہ ہے کہ جس کی وجہ سے اسلامی معاشرہ گمراہ کن عقائد سے محفوظ رہا ہے۔ (احتجاج طبرسی میں یہ مناظرے دیکھے جاسکتے ہیں)

اسلامی معاشرے کو اعتقادی حوالے سے محفوظ رکھنے کے سلسلے میں آئمہ طاہرینؑ نے بہت زیادہ جدوجہد کی ہے اور اپنے حلقہ درس میں ایسے ایسے شاگرد تیار کیے ہیں جنھوں نے تمام اسلامی علاقوں میں اسلامی اعتقادات کا دفاع کیا ہے۔ اس سلسلے میں ہشام بن حکم وہ معروف شیعہ متکلم ہیں جن کے کلامی مباحث کو تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی۔ یہ روایت مشہور ہے کہ جب ہشام بن حکم جوان

تھے، منیٰ میں امام جعفر صادق علیہ السلام کے حلقہ درس میں حاضر ہوئے تو امام علیہ السلام نے ان کا بہت احترام کیا۔ لوگوں نے امامؑ کی جانب سے ہشام کے احترام کا سبب دریافت کیا تو امام علیہ السلام نے ہشام کے مقام و مرتبے کو مزید واضح کرنے کے لیے فرمایا:

اے ہشام! عمرو بن عبید کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا وہ بیان کرو۔ ہشام نے عرض کی یا ابن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں آپ کے سامنے شرم محسوس کرتا ہوں کہ (کہ اپنی تعریف کروں) امام علیہ السلام نے فرمایا: میں خود تمھیں یہ واقعہ بیان کرنے کا حکم دیتا ہوں۔ تب ہشام نے یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں: میں بصرہ گیا تو عمرو بن عبید کے حلقہ درس میں حاضر ہوا۔ وہ کہہ رہے تھے: امامؑ کے وجود کی کوئی ضرورت نہیں۔ درس کے بعد جب شاگرد اپنے اپنے سوالات کر رہے تھے۔ میں نے کہا میں بھی ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ عمرو بن عبید نے کہا: پوچھو! میں نے کہا: کیا آپ کی آنکھ ہے؟ اس نے کہا: یہ کیسا سوال ہے؟ میں نے کہا: ہاں یہ بھی ایک سوال ہے۔ اس نے کہا: ہاں میری آنکھ ہے۔

میں نے کہا: کیا آپ کے کان بھی ہیں؟ اس نے کہا: ہاں۔ میں نے کہا: ان کے ساتھ کیا کرتے ہو؟ اس نے کہا: سنتا ہوں (اسی طرح ہشام نے بدن کے ایک ایک عضو کے بارے میں پوچھا۔) جس کے جواب میں عمرو بن عبید مثبت جواب دیتا ہے۔ آخر میں ہشام نے پوچھا: کیا تمھارا قلب (دل) بھی ہے یا نہیں؟ اس نے کہا: ہاں میرا قلب بھی ہے۔ ہشام نے کہا: اس سے کیا کام انجام دیتے ہو؟ اس نے کہا: کوئی خاص کام انجام نہیں دیتا لیکن میرے بدن کے تمام کام قلب کے ساتھ ہی وابستہ ہیں۔ اگر قلب نہ ہو تو آنکھ دیکھ نہیں سکتی، کان سن نہیں سکتے اور دوسرے اعضائے بدن کام نہیں کر سکتے۔ قلب ان کے کاموں کی تصحیح کرتا ہے ہشام نے کہا: پس کیا مملکت بدن کو قلب کی ضرورت ہے، لیکن معاشرے کو امام کی ضرورت نہیں؟ عمرو بن عبید نے کہا: میرے خیال میں تو ہشام بن حکم ہے۔

ہشام بن حکم، ہشام بن سالم اور مومن طاق جیسے آئمہ اطہارؑ کے شاگرد علم کلام میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور انھوں نے اسلامی معاشرے کی بہت زیادہ خدمات انجام دی ہیں اور اسلامی معاشرے کو خطرناک کلامی و علمی شبہات سے بچایا ہے۔ فہرست نجاشی کے مطابق فقط ہشام بن حکم نے تیس جلدیں کتابیں علم کلام میں لکھی ہیں۔ بنا بریں شیعوں کو آئمہ اطہار علیہم السلام کے زمانے میں اعتقادی اور کلامی حوالے سے کوئی مشکل پیش نہیں آئی لیکن غیبت کبریٰ ے بعد شیعوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے لہٰذا علمائے شیعہ نے اس سلسلے میں اہم اقدامات کرنے ضروری سمجھی۔ اس لیے اس دور میں علم کلام میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔

منجملہ جن لوگوں نے زمانہ غیبت میں اس سلسلے میں پیش قدمی کی ہے وہ آل نوبخت تھے۔ نوبختی ایک شیعہ اور ایرانی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ فضل بن شاذان نے بھی اس سلسلے میں کتاب لکھی ہے۔ اس کے بعد شیخ مفید نے علم کلام میں بہت زیادہ کام کیا ہے۔ اسی طرح شیخ مفید ہی کے دور میں شیخ طوسی اور سید مرتضیٰ علم الہدیٰ کا دور کلام شیعہ کے عروج کا زمانہ کہلاتا ہے۔ یہ لوگ چوتھی صدی ہجری میں گزرے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب بغداد میں مذاہب وادیان کے درمیان بحث مباحثوں کا بازار گرم تھا۔ انھی شیعہ بزرگوں اور ان کے شاگردوں نے ان دو صدیوں میں علم کلام کی ترویج میں بہت زیادہ کام کیے ہیں۔ سید مرتضیٰ علم الہدیٰ نے سب سے زیادہ کلامی کتابیں لکھی ہیں۔ کلامی حوالے سے اسلامی تہذیب وتمدن کو شیعہ متکلمین نے بہت زیادہ رونق بخشی ہے۔ علامہ حلیؒ جو آٹھویں صدی میں گزرے ہیں، سب سے بڑے شیعہ متکلم سمجھے جاتے ہیں، انھوں نے تقریباً ۴۴ کتابیں علم کلام میں لکھی ہیں۔

اسی طرح خواجہ نصیر الدین طوسیؒ نے بھی کلام اور فلسفہ میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ جن کے کام کو دوست و دشمن نے سراہا ہے اور ان کی اسلامی تہذیب میں خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ نصیر الدین طوسی کا شمار اپنے زمانے کے علم وادب کے بزرگ

دانشوروں میں ہوتا ہے۔ سلطان الحکماء خواجہ نصیر الدین اپنے بچپن اور جوانی کے سالوں میں تحصیل علم اور کسب معارف کے لیے بے حد ذوق و شوق کا اظہار کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی جوانی میں مختلف علوم میں مثلاً حکمت، ریاضی اور علم نجوم میں بڑی شہرت حاصل کر لی تھی۔ ابتدائی علوم کی تکمیل کے کچھ ہی عرصے کے بعد اپنے مطالعات کی تکمیل اور اپنی معلومات کی توسیع کے لیے نیشاپور چلے گئے۔

نیشاپور خراسان کے چار بڑے شہروں (مرو، بلخ، ہراشا، نیشاپور) میں سے ایک شہر تھا اور سالہاسال شاہان ظاہریان وغیرہ کا پایہ تخت رہ چکا تھا۔ عرصہ دراز سے علم و دانش کا مرکز تھا اور اپنے دامن میں بہت سے علماء ایران کی پرورش کر چکا تھا۔ اگرچہ وہ کئی بار حملوں کا شکار بھی ہوا خصوصاً قبیلہ "غز" جس نے بڑی تباہی مچائی تھی اور شہر کے اکثر مدارس، مساجد، کتاب خانے ویران ہو گئے تھے پھر بھی مغلوں کے حملہ سے قبل تک نیشاپور علمی اہمیت کا حامل تھا مگر اس وحشی قوم کے حملہ سے کھنڈرات میں بدل گیا۔ جس وقت مغلوں نے نیشاپور حملہ کیا تو لوگوں کے قتل عام سے پہلے خواجہ شہر سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور بیابانوں میں مارے مارے پھرتے رہے۔ جب اسماعیلیوں کو خواجہ کی اس بے سروسامانی کا علم ہوا تو انھوں نے خواجہ کی جستجو کی اور انھیں اپنے پاس لے گئے۔ ان کے علم و دانش اور فضیلت کی وجہ سے اسماعیلیوں، خواجہ کی بے حد عزت و تکریم کرتے تھے، خواجہ وہاں جنگ و جدال کے ہنگاموں سے بے فکر اور آسودہ خاطر ہو کر مطالعہ اور تالیف و ترجمہ میں سرگرم ہو گئے۔

مغلوں کا حملہ

۶۵۱ ہجری میں مغلوں کے شہنشاہ منکوقان نے اپنے چھوٹے بھائی ہلاکو کو ایک بھاری فوج دے کر بھیجا کہ اسماعیلیوں کے قلعوں پر قبضہ کر لے۔ اسماعیلیوں کے بادشاہ خورشاہ نے خواجہ نصیر الدین سے اس معاملے میں صلاح مشورہ کیا کہ ہلاکو خان کے بارے میں کیا کیا جائے؟ خواجہ نے کہا کہ اس طوفان کے سامنے کھڑا ہونا اور اس کا مقابلہ کرنا لاحاصل ہے، اس سے لوگوں کو قتل عام ہوگا تمام تہذیبی و ثقافتی ثمرات نذر آتش ہو جائیں گے اور بہت تباہی و بربادی ہوگی۔

خورشاہ نے خواجہ نصیر الدین کی رائے کو پسند کیا اور اس نے ایک وفد تیار کیا جس میں اس کا بیٹا، بھائی چند ایک دانشور اور سردار شامل تھے۔ وفد کو بہت سے قیمتی تحائف دے کر ہلاکو کے پاس بھیجا۔ وفد کا رئیس خواجہ نصیر الدین تھا۔ خواجہ نے ہلاکو کے سامنے اس قدر سنجیدہ اور محکم باتیں کیں کہ ہلاکو کی تیز اور سرکش طبیعت کو رام کر لیا اور اس طرح اس نے اپنی عقلمندی سے ایک ہولناک فتنے کا بدباب کر دیا۔ خورشاہ قلعہ سے باہر آیا اور ہلاکو کو سامنے زمین کو بوسہ دیا۔ ہلاکو نے جس کو خواجہ کی دانش عقل مندی اور فہم و فراست کی خبر تھی اس کی عزت افزائی کی۔

عظیم الشان لائبریری کی تاسیس

خواجہ نصیر الدین نے اپنی تمام کتابوں اور علمی اوزاروں کو تاخت و تاراج اور نذر آتش ہونے سے بچا لیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ان ساری چیزوں کو اکٹھا کیا اور مراغہ میں ایک لائبریری قائم کی جس میں ۴۰۰۰۰۰ کتابیں موجود تھیں۔ ہلاکو نے مراغہ میں ایک عظیم الشان رصدگاہ تعمیر کرنے کا ارادہ کیا اور اس کام کے لیے اس نے جمال الدین زیدی بخاری کو بلایا تھا، مگر بخاری نے اسے جواب دیا تھا کہ یہ کام صرف خواجہ نصیر الدین ہی کر سکتا ہے جو اس وقت اسماعیلیوں کے قلعے میں مقیم ہے۔ لہٰذا ہلاکو نے اس کام پر

خواجہ نصیرالدین طوسی کو مامور کیا۔

رصدگاہ کی تاسیس

خواجہ نصیر نے مراغہ میں اس موقع کو غنیمت جانا اور ہلاکو کو ترغیب دی کہ رصدگاہ مراغہ (تبریز) میں تعمیر کی جائے اور ساتھ ہی وہ خود اپنے مرغوب خاطر کام میں مصروف ہو جائے چنانچہ خواجہ نصیرالدین علم و دانش کے دامن کو وسیع تر کرنے کے لیے ہلاکو کی نظر وافقت کو دیکھتے ہوئے کچھ مشہور اور نامور منجمین کی مدد سے مراغہ کے شہر میں رصدگاہ کی بنیاد ڈالنے کی سرگرمیوں میں مصروف عمل ہو گئے اور اس کے لیے آلات اور ضروری ساز و سامان فراہم کرنے لگے۔

خواجہ دانشوروں کی کتابوں فضلاء اور متقدمین کے آثار کو حتیٰ کہ اپنے معاصرین کی تصنیفات کو بھی بڑی توجہ اور شوق سے پڑھتے تھے وہ دینوی لذات کو بلائے طاق رکھ کر علماء کی کتابوں پر غور و فکر کرتے تھے اور ان کا گہرا مطالعہ فرماتے تھے اور ان میں روحانی لذت اور ذہنی سرور و کیف محسوس کرتے تھے جیسا کہ فرماتے ہیں:

لذت دنیوی ہمہ ہیچ است نزد من
درخاطر از تغیر آن ہیچ ترس نیست
روز تنعم و شب عیش و طرب مرا
غیر از شب مطالعہ و روز درس نیست

یعنی: ”میرے نزدیک دنیا کی تمام لذتیں بے وقعت ہیں اور میرے دل میں دنیاوی نعمتوں کے چلے جانے کا کوئی خوف و خطر نہیں ہے۔ میرے لیے تو دن کے مزے اور رات کا طرب، رات کے مطالعہ اور دن کے درس و تدریس میں پوشیدہ ہے۔“

اپنی اسی ذاتی اور فطری صفت کی بناء پر بہت تھوڑی مدت میں ایک ایسی لائبریری تیار کر لی جس میں ۴۰۰۰۰۰ عمدہ کتابیں موجود تھیں۔ وہ ہمیشہ اس کتب خانے میں تحقیقی اور مطالعاتی کاموں میں مشغول رہتے اور تشنگان علم و ادب اپنی پیاس بجھاتے۔

خواجہ نصیرالدین طوسی کے مصائب

خواجہ ان علمی شخصیات میں سے ہیں جنھوں نے علم و معرفت کے راستے میں بے شمار مصائب و مشکلات برداشت کی ہیں۔ خواجہ مسلمانوں کی علمی دنیا میں محقق کے نام سے مشہور تھے اور دوست و دشمن ان کے علم کا معترف ہے لیکن اس کے باوجود اس نابغہ دہر شخصیت کو اپنوں ہی کی جانب سے بے پناہ مصیبتیں دیکھنی پڑیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر آغا افتخار حسین سلطنت بغداد کے وقعات کے ضمن میں لکھتے ہیں:

”پھر ایک ایسا دور بھی آیا جب اسی بغداد میں ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا جس میں ایک حاکم نے ایک جید عالم اور سائنس دان کو معقول وجہ کے بغیر قید کر دیا اور پندرہ سال تک یہ دانشور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتا رہا۔ یہ عظیم انسان محقق خواجہ نصرالدین طوسیؒ تھا۔۔۔ چودہ سو سال کی تہذیب کی تاریخ میں مسلمانوں میں متعدد عالم، دانشور اور سائنس دان پیدا ہوئے ہیں لیکن محقق کا خطاب مسلمانوں نے صرف دو کو دیا۔ پہلے محقق طوسی کو اس کے بعد محقق دوانی کو۔“ (۱۹)

ڈاکٹر افتخار حسین محقق طوسی کی علمی خدمات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس طرح پندرہ سال تک یہ عظیم محقق زندان میں اسیر رہا۔ اس اسیری کے دوران طوسی نے بوعلی سینا کی مشہور تصنیف ''اشارات'' کی شرح لکھی جو یورپ کی یونیورسٹیوں میں بھی مقبول ہوئی۔ اس شرح کے خاتمے پر طوسی نے اپنی اسیری کے مصائب کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ زمانہ قدیم میں اہل علم پر جو مظالم کیے گئے وہ میں نے خود نہیں دیکھے لیکن آلام و مصائب کے جو پہاڑ مجھ پر توڑے جا رہے ہیں وہ قیاس انسانی سے باہر ہیں۔''

جب ہلاکو خان کے حکم سے مراغہ (تبریز) میں ایک رصدگاہ قائم کی گئی جس کا انتظام محقق طوسی کے سپرد کیا گیا اور اس طرح علم ہیئت میں تحقیق کے ایک ایسے دور کی ابتدا ہوئی جس کے اثرات صدیوں تک یورپ کے ہیئت دانوں اور ریاضی دانوں کی تحقیقات میں ملتے ہیں۔ مراغہ کی رصدگاہ سائنس کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔۔۔۔ یورپ کے ریاضی دانوں اور ماہرین علم ہیئت نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ اس رصدگاہ میں اجرام فلکی کے مشاہدے، نیز ریاضی اور اقلیدس کے مسائل حل کرنے کے لیے ایسے آلات استعمال ہوتے تھے جو یورپ میں کئی صدیوں بعد کوپرنیکس وغیرہ کے زمانے تک ناپید تھے اس رصدگاہ میں محقق طوسی نے ریاضی کے ایسے مسائل پر مقالے لکھے جن پر عرصے تک اہل یورپ کی نظر نہیں گئی تھی۔ (۲۰)

چنانچہ اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''اصول اقلیدس'' میں طوسی نے خطوط متواتر کے مصادر کا نظریہ پیش کیا جس پر پانچ صدیوں تک یورپ کے ریاضی دان بحث کرتے رہے۔ اسی بنا پر محقق طوسی نے پہلی بار ''علم المثلثات الکرویہ'' کو مستقل حیثیت دی اور اس طرح ایک کتاب ''شکل القطاع''، لکھی جس کے ذریعے ٹرگونومیٹری کی بنیادیں استوار ہوئیں جو جدید ریاضی کے نصف سے زیادہ حصے کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر افتخار حسین مزید لکھتے ہیں:

''ریاضی، ہیئت اور اقلیدس وغیرہ کے علاوہ اخلاقیات اور فلسفے میں بھی طوسی نے بیش بہا کارنامے انجام دیے ہیں۔ بوعلی سینا ''اشارات'' کی شرح کا ذکر ہو چکا ہے۔ طوسی کی شرح پر متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں جن سے منطق میں نئے زاویے پیدا ہوتے ہیں۔ اخلاقیات میں طوسی کی ''اخلاق ناصری'' ارسطو کی اخلاقیات کے بعد سب سے اہم کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔ (یورپ کے فلسفیوں نے اخلاقیات کے فلسفے پر دو صدی بعد توجہ دی)۔ فلسفے اور علم کلام میں ایک نہایت عظیم تصنیف ''تجرید الکلام والعقائد'' (تجرید طوسی) ہے۔''

تاریخ

اسلامی علوم کی ایک شاخ تاریخ ہے جس میں شیعوں کے کردار کو دیکھا جائے تو بظاہر شیعیت گوشہ نشین نظر آتی ہے۔ شیعوں کے بہت سے تاریخی آثار خود سر حکمرانوں کی طرف سے مصائب و مشکلات کی وجہ سے ضائع ہو چکے ہیں۔ پھر بھی فہرست ابن ندیم اور فہرست نجاشی جیسی کتب میں شیعوں کی تاریخی کتب نمایاں طور پر نظر آتی ہیں جو خاص تاریخی حوالوں کے لحاظ سے اہم ترین تاریخی کتب سمجھی جاتی ہیں۔ مثلاً صفین، جمل اور واقعہ کربلا کے بارے میں شیعوں نے بہت سی تاریخی کتب لکھی ہیں۔ شیعوں کا تاریخ کے بارے میں یہ اہتمام، تاریخ کے بارے میں ان کی دینی بصیرت کو ظاہر کرتا ہے چونکہ شیعوں نے قرآن مجید اور آئمہ اطہار علیہم السلام کی تعلیمات کی روشنی میں تاریخ کو ہمیشہ ''عبرت'' کے عنوان سے لیا ہے۔

''لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَبْصَارِ'' (۲۲)

شیعوں کے نزدیک تاریخ سرچشمہ معرفت ہے اور وہ اسے عبرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور یہی شیعوں کی تاریخ میں دلچسپی کا سبب بنتی ہے۔ دوسری طرف شیعوں کے امام اول حضرت علی علیہ السلام نے بھی شیعوں کو تاریخ اور تاریخی واقعات سے تفنن طبع کے بجائے عبرت حاصل کرنے کی وصیت کی ہے۔ چنانچہ نہج البلاغہ کے مکتوب نمبر ۳۱ میں مولا امیر المومنینؑ اپنے فرزند دلبند حضرت امام حسن علیہ السلام کو وصیت کرتے ہوئے ایک جگہ فرماتے ہیں:

"اے فرزند! اگرچہ میں نے اتنی عمر نہیں پائی جتنی اگلے لوگوں کی ہوا کرتی تھیں، پھر بھی میں نے ان کی کارگزاریوں کو دیکھا ہے، ان کے حالات و واقعات میں غور کیا ہے اور ان کے چھوڑے ہوئے نشانات میں سیر و سیاحت کی، یہاں تک کہ گویا میں بھی انہی میں کا ایک ہو چکا ہوں۔ بلکہ ان سب کے حالات و معلومات جو مجھ تک پہنچ گئے ہیں، ان کی وجہ سے ایسا ہے کہ گویا میں نے ان کے اول سے لے کر آخر تک کے ساتھ زندگی گزاری ہے۔" (۲۳)

تاریخ کے بارے میں حضرت امام علی علیہ السلام کا یہ بیان شیعوں کو تاریخی بصیرت عطا کرتا ہے جس کے بعد وہ تاریخ کا بطور عبرت مطالعہ کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے شیعوں نے تاریخ نگاری کے باب میں بہت بلند قدم اٹھائے ہیں۔ اگر ہم غیر امامی شیعوں کو بھی شامل کریں تو شیعوں کی تاریخی کتب کی فہرست اور بھی وسیع ہو جاتی ہے۔

مشہور ہے کہ سب سے بڑے مورخ اور سیرت نگار "ابن اسحاق" شیعہ تھے۔ بہت سے قرائن بھی اس بات پر موجود ہیں۔ جیسا کہ ابن ہشام نے ابن اسحاق سے روایت لیتے وقت بہت سی باتیں حذف کر دی ہیں جو اس دعویٰ کی دلیل ہے، چونکہ محققین کے مطابق ابن ہشام نے، ابن اسحاق سے نقل کرنے میں جن باتوں سے پرہیز کیا ہے وہ اہل بیت اطہار علیہم السلام کے بارے میں تھیں۔ ابن اسحاق کے بعد آئمہ اہل بیتؑ کے جن اصحاب نے تاریخ کے خاص حالات لکھے ہیں، ان میں لوط بن یحییٰ المعروف ابی مخنف اور ان کے بعد واقدی، یعقوبی اور مسعودی ہیں۔ البتہ یہ لوگ اصطلاحاً امامی مذہب نہیں ہیں بلکہ محبت اہل بیتؑ رکھنے کی وجہ سے شیعہ مشہور ہیں اور ان کی کتابوں میں اہل بیتؑ کی مخالفت کے بارے میں کوئی بات نہیں ملتی۔ اس لحاظ سے انہی شیعی مورخ کے عنوان سے پہچانا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ اہل بیت مخالف متعصب علماء بھی اسی خیال کا اظہار کرتے ہیں۔ البتہ شیعوں کے لیے تاریخ نگاری کی مشکلات بھی بہت زیادہ تھیں جو ایک الگ تحقیق طلب موضوع ہے۔ ان سب مشکلات کے باوجود شیعوں کو اپنے نمایاں عقائد اور سیاسی موقف کی وجہ سے اسلامی تہذیب و تمدن کی تاریخ لکھنے والے نظر انداز نہیں کر سکتے۔

حوالہ جات

۱۔ خامنہ ای ڈاٹ آئی آر

۲۔ جاحظ نے عثمانیہ کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس گروہ کے بارے میں تفصیلات موجود ہیں۔

۳۔ شیخ مفید، الارشاد، ص ۲۷۱

۴۔ طوسی، اختیار معرفۃ الرجال، تحقیق حسن مصطفوی، ص ۲۷۸، ۲۷۵ / شیخ محمد تقی شوشتری، قاموس الرجال، ج ۳، ص ۴۱۶

۵۔ شیخ ابراہیم نصر اللہ، حلب والتشیع، ص ۲۱، ۲۴

۶۔ علی اصغر فقیہی، آل بویہ، ص ۴۶، ۷۸۹

۷۔علی اصغر فقیہی، آل بویہ، ص ۵۴۷

۸۔جاڑا حسین بخش، مقدمہ تفسیر انوار النجف، ص ۱۵۱

۹۔سیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، ج ۲، ص ۳۲۸ طبقات المفسرین

۱۰۔مسند احمد حنبل، ج ۱، ص ۱۱۹ / سید عبدالحسین شرف الدین، مولفوا الشیعہ فی صدر الاسلام، ص ۱۵، ۱۴

۱۱۔نجاشی، فہرست مصنفی الشیعہ، ص ۴

۱۲۔شیخ مفید، الاختصاص، ص ۵۳ /مجلسی، بحار الانوار، ج ۴۶، ص ۳۲۸

۱۳۔ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج ۱، ص ۱۸

۱۴۔شبلنجی، نور الابصار، ص ۱۶۷، ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۳۲۵ /علی بن عیسیٰ اربلی، کشف الغمہ، ج ۳، ص ۲۱۹ / ابن حجر، ہیثمی، الصواعق المحرقہ، ص ۲۰۷، ابن صباغ مالکی، الفصول المہمہ، ص ۳۰۴

۱۵۔مناقب ابن شہر آشوب مازندرانی جلد ۵، ص ۱۲۷، بحار الانوار، جلد ۱۲، ص ۱۷۲، دمعہ ساکبہ جلد ۳، ص ۱۸۳

۱۶۔آغا افتخار حسین، قوموں کی شکست و زوال کے اسباب کا مطالعہ، ص ۳۷

۱۷۔معالم العلماء، ص ۱ طبع ایران

۱۸۔سید حسن صدر، تاسیس الشیعہ لعلوم الاسلام، ص ۳۰۴ /محمد رضا حکیمی، دانش مسلمین، ص ۳۲۳

۱۹۔آغا افتخار حسین، قوموں کی شکست و زوال کے اسباب کا مطالعہ، ص ۳۴، ۳۳

۲۰۔ آغا افتخار حسین، قوموں کی شکست و زوال کے اسباب کا مطالعہ، ص ۳۷، ۳۶

۲۱۔ایضاً

۲۲۔یوسف: آیت ۱۱۱

۲۳۔نہج البلاغہ، مکتوب نمبر ۳۱، ترجمہ مفتی جعفر حسینؒ

□□□□□

اسلامی تہذیب کی تاریخی بنیاد

پروفیسر میاں انعام الرحمن

انسانی زندگی گونا گوں پہلوؤں سے عبارت ہے اور ان تمام پہلوؤں پر تاریخ کی بسیط چادر تنی ہوئی ہے۔ صرف اسی ایک فقرے کو بغور دیکھیے کہ اس کے دو ٹکڑے ہیں۔ ”اور“ نے ان ٹکڑوں میں ربط اور معانی پیدا کیے ہیں۔ اگر ”اور“ کے بعد والا ٹکڑا بے معنی ہے تو اس کا ذمہ دار ”اور“ سے پہلے والا ٹکڑا ہے کیونکہ اس کی بنیاد پر ہی دوسرے ٹکڑے کی تخلیق ممکن ہوئی ہے، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ دوسرا ٹکڑا ”تخلیق“ ہوتے ہوئے بھی، پہلے ٹکڑے سے الگ، اپنی ذات میں کوئی آزاد معنی نہیں رکھتا۔ اسی طرح اگر ”اور“ کے بعد والا ٹکڑا ہمیں نئے مفاہیم سے روشناس کراتا ہے تو اس کا کریڈٹ بھی اصلاً ”اور“ سے پہلے والے ٹکڑے کو ملنا چاہیے کہ اس نے بہت فراخی سے بامعنی بنیاد فراہم کی ہے۔ یہ صورت حال صرف اسی فقرے یا مجموعی طور پر کسی بھی تحریر کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ کار گفتگو اور اعمال تک پھیلا ہوا ہے۔ مثلاً، اگر کوئی فرد دوران گفتگو میں، اپنے ہی بیان کیے ہوئے نکات بھول جائے تو خالی الذہن ہونے اور بے بنیاد ہو جانے کے باعث اس کی آئندہ گفتگو مجہول اور انتہائی بے معنی ہو جائے گی۔ اگر کوئی فرد، بھول اور نسیان کا شکار نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود اس کی بات دانش و حکمت سے تہی اور بے معنی معلوم ہو تو سمجھ لیا جانا چاہیے کہ اس کی گفتگو کی بنیاد ہی انتہائی ناقص ہے اور اس ناقص بنیاد پر وہ کوئی حکیمانہ نکات اٹھانے سے معذور اور قاصر ہے۔ یہی بات فرد کے اعمال کی بابت بھی سچ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسانی زندگی کا ”حال“ اپنے ماضی سے جدا اور الگ وجود نہیں رکھتا۔ اپنے متصل ماضی کے ساتھ حال کا گہرا اور بامعنی تعلق ہوتا ہے۔ ماضی کے ساتھ اسی تعلق اور تعلق کی نوعیت سے انسانی زندگی کے ”حال“ کی نہ صرف تعبیر ممکن ہوتی ہے بلکہ حال کے رخ اور سمت کا تعین بھی ماضی سے ہوتا ہے۔

اگر مذکورہ گفتگو پر گہری نظر ڈالی جائے تو انسانی زندگی کے دو پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں: (۱) حافظہ، جس کا معکوس بھول اور نسیان ہے۔ (۲) معقول بنیاد، جس کا معکوس ناقص اور لایعنی بنیاد ہے۔ اب اگر انہی نکات کو توسیع دیتے ہوئے، گروہی زندگی پر منطبق کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ گروہی زندگی کے اعمال، گفتگو اور تحریری سرمایے کے معیار و ساخت میں ”حافظے اور معقول بنیاد“ کی حیثیت کلیدی ہے۔ جہاں تک حافظے کا تعلق ہے، کسی گروہ کی تاریخ اس کا حافظہ ہے اور معقول بنیاد اس کی تاریخ کا سر آغاز ہے (اگر وہ دستیاب ہو سکے)۔ اس کا ایک مطلب یہ ہوا کہ گروہی زندگی کے اعمال، گفتگو اور تحریری سرمائے میں اگر

کوئی گڑبڑ پائی جائے تو موردِ الزام، تاریخ (اور سرِ آغازِ تاریخ) کو ہی ٹھہرایا جانا چاہیے، کیونکہ اس کے پیچھے یہی عوامل کارفرما ہیں۔ اسی طرح اگر گروہی زندگی کے اعمال مثبت جہات لیے ہوئے ہیں، گفتگو میں ادب آداب اور شائستگی کے اسالیب مستور ہیں اور تحریری کاوشیں حسن و خوبصورتی اور تخیل آفرینی کی بوقلمونی سے مالا مال ہیں تو اس کا کریڈٹ بھی "تاریخ اور سرِ آغازِ تاریخ" کو دیا جانا چاہیے۔

اب اگر ہم دنیا کی مختلف تہذیبوں کی گروہی زندگی پر سرسری نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ان کے "حال" کی تعمیر و بنیاد کے پیچھے ان کا اجتماعی حافظہ (تاریخ) کارفرما ہے۔ مغرب کی موجودہ مادی ترقی اور سیکولر اخلاقیات، صنعتی انقلاب کی مرہونِ منت ہے اور صنعتی انقلاب کے پیچھے روشن خیالی کی تحریکات جیسے ٹھوس عوامل موجود ہیں۔ اب اکیسویں صدی کا مغرب، اگر دنیا کی راہنمائی کرنے کی استعداد رکھتا ہے تو اس کا کریڈٹ بجا طور پر اس کی تاریخ اور اس کے سرِ آغازِ تاریخ کو ملنا چاہیے۔ یہ نکتہ اگرچہ قابلِ بحث ہوگا کہ مغرب کا سرِ آغازِ تاریخ کیا ہے؟ اپنے موضوع کے بنیادی نکتے پر توجہ مرکوز رکھنے کی خاطر ہم یہاں اس بحث سے صرفِ نظر کریں گے لیکن اگر مغرب دنیا کی راہنمائی کرنے کا "دعویٰ" کرتا ہے اور دنیا کی دیگر تہذیبیں اس کے دعوے کی بابت تحفظات رکھتی ہیں تو ان تحفظات کی ضرب، مغربی تہذیب کے حال کے بجائے اس کی تاریخ پر پڑنی چاہیے کیونکہ اس کے حالیہ دعوے کی بنیاد اس کی اپنی تاریخ پر ہے۔ اب ذرا غور کیجیے کہ کیا مغرب کا دعویٰ مکمل طور پر غلط ہے یا اس میں کہیں کہیں سچائی کی لہریں بھی بل کھاتی دکھائی دیتی ہیں؟ ظاہر ہے کہ مغرب کا تہذیبی برتری کا دعویٰ مکمل طور پر غلط نہیں ہے کیونکہ اس کی بعض تہذیبی اقدار ایسی مثبت جہات کی حامل ہیں جن کے متعلق دیگر تہذیبوں نے انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں کی۔ اس کا ایک مطلب یہ ہوا کہ مغربی تہذیب کی بنیاد (یعنی اس کی تاریخ اور سرِ آغازِ تاریخ) مکمل طور پر اگرچہ لایعنی اور منفی نہیں ہے لیکن مکمل طور پر بامعنی اور مثبت بھی نہیں ہے۔

اب ہم ایک دوسری تہذیب کی گروہی زندگی پر سرسری نظر ڈالیں گے جسے 'اسلامی تہذیب' کہا جاتا ہے۔ اس تہذیب کی صورتِ حال انتہائی عجیب و غریب ہے۔ یہ تہذیب ایک طرف داخلی و خارجی اعتبار سے ٹوٹ پھوٹ اور شکست و ریخت کا شکار ہے تو دوسری طرف دنیا کی راہنمائی کرنے کی بھی دعوے دار ہے۔ مذکورہ بالا اصول کے مطابق، اس کی اس متضاد حالت کی بنیاد اس کی اپنی تاریخ میں مضمر ہے۔ اس تہذیب کی تاریخ دوعملی پر مشتمل ہے جو متوازی اور یکساں طور پر اس کے حال پر اثرانداز ہو رہی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ "دوعملی" کیا ہے؟ ہماری رائے میں اس تہذیب کے حال کی بنیاد میں ایک طرف "تاریخی اسلام" کارفرما ہے اور دوسری طرف "دینِ اسلام" اس کے حال کی تعمیر کر رہا ہے۔ اس لیے مذکورہ دوعملی یا اس کے حال میں موجود تضاد، حقیقت میں تاریخی اسلام اور دینِ اسلام کی باہمی آویزش کا نتیجہ ہے۔ یہاں یہ نکتہ البتہ قابلِ بحث ہے کہ کون سا اسلام اس تہذیب کی ٹوٹ پھوٹ کا ذمہ دار ہے اور کون سا اسلام اس کے راہنمائی کے دعوے کے پیچھے کارفرما ہے۔ سرِدست ہم اس نکتے پر بحث نہیں کریں گے۔

جہاں تک اسلامی تہذیب کے "حال" کی تعمیر کرنے والی تاریخ کے تعین کا تعلق ہے، وہ حال کی متضاد صورتِ حال سے متعین ہو کر، دوعملی کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ یہاں منطقی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دوعملی کی صورتِ حال کیونکر پیدا ہوئی؟ اس سوال کا ایک سطری جواب یہ ہے کہ تاریخی اسلام (Historical Islam) کو دینِ اسلام کے متوازی اور یکساں مقام سے نواز

آگیا، شاید (بلکہ یقیناً) دینِ اسلام سے بھی بڑھ کر مقام دیا گیا۔ اب اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تاریخی اسلام (Historical Islam) سے کیا مراد ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مختلف زمانوں، مختلف خطوں، مختلف ثقافتوں، مختلف اداروں اور مختلف افراد کی تعبیرات و تشریحات اور تاریخی عمل (Historical Process) وغیرہ سے درجہ بدرجہ اسلام کی جو صورت سامنے آتی رہی، وہ صورت زمانی ترتیب سے ارتقا پذیر ہوتے ہوئے تاریخی اسلام (Historical Islam) کی تشکیل کا باعث بنی۔ یہ تعبیرات و تشریحات اور تاریخی عمل وغیرہ، اگرچہ کہیں کم کہیں زیادہ، دینِ اسلام سے مَس کرتے ہیں لیکن ان کی بنت و بافت میں کلیدی حصہ، زمانی و مکانی عُرف اور افراد کے فہم کا ہے۔ یہ بات بحث طلب نہیں ہے کہ زمانی و مکانی عُرف نہ صرف تغیر پذیر رہتا ہے بلکہ افراد کے فہم کی تشکیل میں بھی اس کا بنیادی کردار ہوتا ہے، لہٰذا افراد کا فہم بھی غیر متغیر اور ابدی نہیں رہتا۔ اب ذرا غور کیجیے کہ اگر اسلامی تہذیب کسی بھی زمانے میں اور کسی بھی خطے میں اپنا "حال" تاریخی اسلام (Historical Islam) کی بنیاد پر تعمیر کرے گی تو اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا؟ ظاہر ہے، اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ کسی مخصوص زمانی و مکانی عُرف کو زبردستی اس تہذیب کے حال پر مسلط کیا جائے گا اور حال کے زمانی و مکانی عُرف سے صرفِ نظر کیا جائے گا، اقدار کے آفاقی، کلی اور ابدی نظام کے بجائے کسی (زمانے یا شخص) کے فہمِ اسلام کو (جو ابدی نہیں ہو سکتا، بلکہ اضافی اور تغیر پذیر ہوتا ہے) ابدی گردانتے ہوئے اسلامی تہذیب کے حال پر منطبق کیا جائے گا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ معاصر اسلامی تہذیب کی تعمیر میں تاریخی اسلام (Historical Islam) کے بنیادی کردار اور تاریخی اسلام کی منفیت نے اس تہذیب کے "حال" کو المیے سے دوچار کر دیا ہے۔ اسلامی تہذیب کے "حال" کی بنیادوں میں اب کہیں تصوف کی روایات ہیں، کہیں ائمہ اربعہ و جمہور فقہا کی فنی موشگافیاں ہیں اور کہیں بادشاہوں و سلاطین کی وہ پالیسیاں ہیں جن پر اسلامیت کا ٹھپہ لگایا گیا۔ ان تمام سلسلوں کا تعلق، حقیقت میں تاریخی اسلام (Historical Islam) کے ساتھ ہے، جبکہ دینِ اسلام کا وجود ان سے الگ تھلگ قائم ہے۔

اب اس سوال کو لیجیے کہ اسلامی تہذیب، مغربی تہذیب (اور دیگر تہذیبوں) سے کن معنوں میں مختلف ہے؟ کیونکہ اسلامی تہذیب کے حال کی تعمیر، دیگر تہذیبوں کے مانند، اپنی تاریخ پر ہوئی ہے، اس لیے لامحالہ ہمیں اسلامی تہذیب کے حال کی تعمیر کرنے والی اس تاریخ کا سراغ لگانا ہوگا جو تاریخ ہوتے ہوئے بھی تاریخ کے روایتی تصور سے مختلف اور ممتاز ہو۔ اب اگر تاریخی اسلام (Historical Islam) کو اسلامی تہذیب کے حال کی بنیاد تسلیم کر لیا جائے (اور وہ حقیقتاً ہے بھی) تو پھر دیگر تہذیبوں سے اسلامی تہذیب کو ممیز کرنا تقریباً ناممکن ہو جائے گا۔ اگرچہ اس نکتے کی صراحت ضروری معلوم ہوتی ہے لیکن طوالت سے بچنے کی خاطر ہم فقط یہی کہنے پر اکتفا کریں گے کہ تاریخی اسلام (Historical Islam) اور دیگر تہذیبوں کی تاریخ (History) کے مابین ساختیاتی اعتبار سے کوئی بنیادی فرق قائم کرنا مشکل کام ہے، کیونکہ ہر دو کے ہاں تاریخی ارتقا (Historical Evolution) کا اصول کارفرما ہے۔ جب کوئی اصولی اور بنیادی فرق موجود ہی نہیں ہے تو پھر ہر دو تہذیبوں کے حال کا فرق اور ایک دوسرے پر برتری کا دعویٰ بھی غیر اہم اور بے معنی ہو جاتا ہے۔ یہاں منطقی طور پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلامی اور غیر اسلامی تہذیبوں کے درمیان کوئی اساسی فرق موجود نہیں ہے تو پھر مغربی تہذیب خوشحالی اور ترقی کی شاہراہ پر کیوں گامزن ہے؟ اور اسلامی تہذیب انحطاط و زوال کا کیونکر شکار ہے؟ اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ جس طرح آج کی مغربی تہذیب اپنے متصل ماضی سے منسلک ہے، اسی طرح اسلامی تہذیب بھی اپنے متصل ماضی سے جدا نہیں ہے۔ متصل ماضی سے تعلق کا یہ اصول دونوں

تہذیبوں کو اساسی اعتبار سے یکساں قرار دیتا ہے لیکن ظواہر میں فرق اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ تاریخی ارتقا کے دوران میں تاریخی عوامل کے مقابل میں اپنایا گیا رویہ دونوں تہذیبوں کے ہاں منفرد اور جدا جدا رہتا ہے۔ یکساں تاریخی عوامل کے مقابل میں دونوں تہذیبوں نے کس قسم کے رویے کا اظہار کیا اور منفرد تاریخی عوامل کے مقابل میں کیا طرزِ عمل اختیار کیا؟ یہ ایک طویل بحث ہے اور سر دست ہمارے بنیادی موضوع سے خارج ہے۔

بہر حال، موجودہ زمینی حقائق کے مطابق اسلامی تہذیب کا مذکورہ داخلی تضاد اسے مغربی تہذیب (اور دیگر تہذیبوں) سے ممیز کرتا ہے۔ جیسا کہ ذکر ہوا، یہ تضاد یا دو عملی، بنیادی طور پر تاریخی اسلام اور دینِ اسلام کی باہمی آویزش کا نتیجہ ہے۔ ہم یہ کہنے کی جسارت تو نہیں کر سکتے کہ اپنے آغاز سے لے کر دورِ حاضر تک یہ تہذیب ''دو عملی'' کا شکار رہی ہے لیکن یقیناً پچھلی کئی صدیوں سے یہ دو عملی ایک تہذیبی قدر کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ اسلامی تہذیب کے ''حال'' کی تعمیر میں ایک طرف (تاریخی جبر سے ماورا) دینِ اسلام کی آفاقی اقدار سر گرمِ عمل ہیں، مثلاً صبر، شکر، ایثار، عدل، احسان، رحم دلی، خیر خواہی، تقویٰ، دیانت، امانت، ایفائے عہد، اخلاص، تواضع، شرم و حیا، توبہ و استغفار اور توکل علی اللہ وغیرہ، اور دوسری طرف اس تہذیب کا ''حال'' تاریخی اسلام (Historical Islam) کی جولان گاہ بنا ہوا ہے، مثلاً بے صبری، عجلت، ناشکری، خود غرضی، ظلم، بدخواہی، بے خوفی، بد دیانتی، خیانت، عہد شکنی، بغض و عناد، ریا، خود ستائی، غصہ، بے حیائی، لہو و لعب، غرور و تکبر، حسد، بہتان، جھوٹ، رشوت خوری اور بد اخلاقی وغیرہ جیسی اقدار اس تہذیب کے عملی احوال کی نمائندہ بن گئی ہیں۔ ہمیں اعتراف کر لینا چاہیے کہ اسلامی تہذیب کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جھوٹ، ملاوٹ، رشوت خوری اور بد دیانتی جیسی منفی اقدار سرایت کر گئی ہیں، کیونکہ یہ اعتراف اس حقیقت کی نفی نہیں کرتا کہ اس تہذیب کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے کہیں کونے کھدرے میں سچ، خلوص، دیانت اور صبر و شکر جیسی آفاقی اور غیر متغیر اقدار بھی سر اٹھاتی رہتی ہیں۔ یہ صورتِ حال ایک ایسی تہذیبی قدر کو جنم دیتی ہے جسے ہم نے دو عملی یا تضاد کا نام دیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ یہی تضاد، داخلی اعتبار سے اسلامی تہذیب کے لیے اور خارجی اعتبار سے عالمِ انسانیت کے لیے، مثبت جہات کا اشاریہ بن گیا ہے۔ خیال رہے کہ یہ تضاد بنیادی طور پر دینِ اسلام کا پیدا کردہ ہے، اس کے برعکس تاریخی اسلام (Historical Islam) اسلامی تہذیب کی انفرادی و گروہی زندگی کو (دیگر تہذیبوں کی تاریخ کے مانند) تاریخی جبر کا مطیع کرنے پر تلا ہوا ہے۔

بحث کے اس مقام پر اب واضح ہو رہا ہے کہ اصولی اعتبار سے، اسلامی تہذیب کے حال کی تعمیر کرنے والی تاریخ، مغربی تہذیب (اور دیگر تہذیبوں) کے حال کی تعمیر کرنے والی تواریخ سے کن معنوں میں مختلف ہے۔ اس بنیادی نکتے کی تنقیح سے نہ صرف اسلامی تہذیب کی دو عملی یا تضاد کو ختم کیا جا سکتا ہے بلکہ اس کے قدری نظام کو بھی ساختیاتی اعتبار سے دیگر تہذیبوں سے ممتاز کیا جا سکتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کسی بھی زمانے اور کسی بھی خطے میں اسلامی تہذیب کے حال کو تعمیر کرنے والی تاریخ، دینِ اسلام ہونا چاہیے۔ دینِ اسلام سے مراد تاریخی اسلام نہیں، بلکہ قرآن و سنت ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہوا کہ اسلامی تہذیب اپنے حال کی تعمیر میں، مغربی تہذیب (اور دیگر تہذیبوں) کے برخلاف زمانی ارتقا پر مبنی تاریخ کو زیادہ اہمیت نہیں دیتی، کیونکہ ایسی تاریخ میں اگرچہ کچھ نہ کچھ حکمت و دانش کے اسرار و رموز پوشیدہ ہو سکتے ہیں لیکن یہ اسرار و رموز، تاریخی عمل میں انسانی کردار کے مختلف اسالیب کا اظہار ہونے کی وجہ سے، ابدی صداقتوں اور غیر متغیر جہات کے حامل نہیں ہو سکتے۔ اس لیے ان کی بنیاد پر تعمیر کیا گیا کوئی بھی ''حال'' اپنی ساخت کے لحاظ سے ناقص اور یک رخا ہی ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تہذیب اپنے ''حال'' کی تعمیر تاریخی اسلام کے بجائے

ہمیشہ دینِ اسلام کی بنیاد پر قائم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ (موجودہ دوعملی یا تضاد اسی کوشش کا اظہار ہے) یہاں ایک بہت اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی تہذیب کے حال کی تعمیر کرنے کے اعتبار سے دینِ اسلام، تاریخی اسلام اور دیگر تہذیبوں کی تاریخ سے کن معنوں میں مختلف ہے؟ اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ قرآن مجید کا غیر متغیر انداز میں، کئی صدیوں سے سینہ مسلسل کے ساتھ ہم تک پہنچنا، اسے دیگر تاریخی بنیادوں (تاریخی اسلام وغیرہ) سے نہ صرف بہت ممتاز کر دیتا ہے بلکہ انتہائی ٹھوس انداز میں آشکارا کر دیتا ہے کہ قرآن مجید، تاریخی عمل میں انسانی کردار کے مختلف اسالیب کا اظہار نہیں ہے، یعنی تاریخ کی پیداوار نہیں ہے، بلکہ تاریخ کو درست سمت میں گامزن کرنے کا ایک مستقل ذریعہ ہے۔ اس کے برعکس، تاریخی اسلام و دیگر تہذیبوں کی تواریخ، حقیقت میں تاریخ کی پیداوار ہیں، اس لیے متغیر اور غیر ابدی ہیں۔ اب ذرا غور کیجیے کہ جو نام نہاد بنیاد، خود تاریخ کی پیداوار ہو، وہ کسی ایسے حال کی تعمیر کیونکر کر سکتی ہے جو تاریخی جبر سے ماورا ہو؟ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر اسلامی تہذیب کے حال کی تعمیر میں سے دینِ اسلام کے کردار کو منہا کر دیا جائے تو نہ صرف اسلامی تہذیب بلکہ عالمِ انسانیت بھی تاریخی قوتوں کی اس طرح مطیع ہو جائے گی جس طرح کسی مشین کے کل پرزے ہوتے ہیں۔

یہاں پر یہ دلچسپ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ کیا قرآن مجید، جو دینِ اسلام کی بنیاد ہے، خود تاریخ کی پیداوار نہیں ہے؟ یہ سوال بلاشبہ بہت منطقی اور برمحل معلوم ہوتا ہے۔ قرآن مجید کے تاریخ کی پیداوار ہونے کے دو نمایاں پہلو ہو سکتے ہیں: (۱) قرآن مجید، اپنے سے قبل کی تاریخ کا نتیجہ ہے۔ (۲) قرآن مجید، اپنے نزول کے زمانے کی ضرورت ہے۔

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے، اس کا جواب خدا، رسول، ملائکہ اور آخرت وغیرہ جیسے مباحث کے بغیر ادھورا اور نامکمل رہے گا۔ چونکہ یہ مباحث سرِدست ہمارے موضوع سے خارج ہیں، اس لیے اتنا عرض کرنا کفایت کرے گا کہ قرآن مجید کا اعجاز پہلے سوال کی نفی کر دیتا ہے اور پھر قرآن مجید کے بعد کی تاریخ میں کسی ایسی ہی کتاب کی عدم موجودگی، جو اس تاریخی سلسلے کو جاری و ساری رکھتی، اس امر پر دال ہے کہ قرآن مجید، تاریخ کی پیداوار نہیں ہے۔ جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے، وہ قدرے اہم معلوم ہوتا ہے کیونکہ خود مسلم مفسرین، مکی و مدنی آیات کی تقسیم اور شانِ نزول وغیرہ پر خاصا زور دیتے ہیں جس سے یقیناً قرآن مجید اپنے نزول کے زمانے اور حالات سے مخصوص ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود ایک اہم نکتہ قرآن مجید کو اس کے نزول کے سیاق سے بالاتر کر کے اس کی ابدیت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دیتا ہے۔ مسلم مفسرین کی آرا اپنی جگہ اہم ہو سکتی ہیں، لیکن نبی پاک ﷺ کے زمانے میں ہی قرآن مجید کی ترتیب کا بدل دیا جانا اور اس بدلی ہوئی ترتیب کے ساتھ قرآن مجید کا ہم تک پہنچنا، قرآن مجید کو اپنے نزول کے زمانے اور ضروریات سے ماورا کر دیتا ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے ماہنامہ الشریعہ اگست ۲۰۰۶ میں ہمارا مضمون ''معاصر تہذیبی تناظر میں مسلم علمی روایت کی تجدید'' ملاحظہ کیجیے)۔

ابتدائی سطروں میں ہم نے ''حافظے اور معقول بنیاد'' کی بات کی تھی اور گزارش کی تھی کہ کسی قوم یا تہذیب کا حافظہ، اس کی تاریخ ہوتی ہے جس کی بنیاد پر ہی اس کے حال کی تعمیر ہوتی ہے۔ تاریخ سے کٹ کر کوئی قوم یا تہذیب، اپنے حال کی تعمیر کر ہی نہیں سکتی۔ غور طلب مقام ہے کہ اسلامی تہذیب کی تاریخ، یعنی دینِ اسلام کی ثقاہت و ابدیت کا کوئی دوسری تہذیب مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس تہذیب کے حال کی تعمیر کرنے والی یہ قوت یعنی دینِ اسلام الکل پچو نہیں۔ یہ نہ صرف تاریخی عمل کی پیداوار نہیں ہے، بلکہ اس میں زمانی و مکانی آلائشوں کی شمولیت کا ایک فی صد بھی امکان نہیں ہے، حالانکہ مغربی تہذیب (اور دیگر تہذیبوں کی تاریخ)

کا اس نقص سے بچ نکلنا ناممکن امر ہے۔ ایک طرف حفظِ قرآن کی روایت ہمیں بے تاریخ ہونے کے کسی بھی خدشے سے بے نیاز کر دیتی ہے اور دوسری طرف علمِ حدیث میں تعدیل و جرح کے اصول، خود تاریخ کو کسی بھی قسم کے بگاڑ کا شکار ہونے سے بچا لیتے ہیں۔ اگر مسلمان ہونے کی حیثیت سے بات کی جائے تو وہ تاریخ، جس کی بنیاد پر (ہر زمانے اور ہر خطے میں) اسلامی تہذیب کے حال کی تعمیر ہوتی ہے، اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے اٹھایا ہو تو وہ کیونکر بگاڑ کا شکار ہو کر اس تہذیب کے حال کی غلط تعمیر کر سکتی ہے؟ بلاشبہ اسلامی تہذیب کو اپنے حال کی تعمیر کے لیے، دنیا کی کسی بھی تہذیب سے بہت بڑھ کر، بہت ہی مضبوط، ٹھوس اور پائیدار بنیاد حاصل ہے جو تاریخی جبر سے ماورا ہے۔ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس تہذیب کی تاریخ کا سرآغاز بھی انتہائی بامعنی ہے: 'الست بربکم' (اعراف ۷:۱۷۲)

بہر حال، جب دینِ اسلام کو اسلامی تہذیب کے "حال" کی بنیاد تسلیم کر لیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ تاریخی اسلام (Historical Islam) کا کیا مقام ہے؟ اگر دیگر تہذیبوں کی تواریخ صرف منفی اقدار کو جنم نہیں دیتیں تو کیا تاریخی اسلام (Historical Islam) صرف منفی اقدار کا حامل ہے؟ یقیناً نہیں، کیونکہ تاریخی ارتقا (Historical Evolution) اور تاریخی عمل کے دوران میں دینِ اسلام کا کردار ہمیشہ موجود رہا ہے، چاہے یہ بہت بنیادی نوعیت کا ہو جس طرح ہمارے اسلاف کے ہاں تھا، یا یہ دوعملی یا تضاد پیدا کرنے تک محدود ہو، جس طرح معاصر اسلامی تہذیب میں کارفرما ہے۔ تو کیا پھر غزالیؒ، ابن تیمیہؒ، شاہ ولی اللہؒ، ائمہ اربعہ، جمہور فقہا اور صوفیا کرامؒ وغیرہ کا ہماری تہذیب کے "حال" کی تعمیر میں کوئی کردار ہو سکتا ہے؟ ہماری نظر میں ان کا کردار "پیشوائیت" والا ہرگز نہیں ہے جیسا کہ عملی طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ہماری تہذیب کے "حال" کے ساتھ ان کا تعلق "ہم سفری" کا ہے۔ وہ ہمارے ہم سفر ہیں اور ہم ان کے ہم سفر ہیں، ہم ایک دوسرے کے پیشوا ہرگز نہیں ہیں۔ ہم سفری کے اثبات اور پیشوائیت کی نفی کی یہ منطق بظاہر عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ دو مختلف زمانوں میں ہوتے ہوئے ہم لوگ کیسے ہم سفر ہو سکتے ہیں؟ اور پھر وہ لوگ تو ہم سے پہلے گزر چکے ہیں، اس لیے ان کی بابت ہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہمارے پیشوا ہیں یا نہیں ہیں لیکن یہی بات معکوس انداز میں کیسے کہی جا سکتی ہے؟ ہم گزارش کریں گے کہ اوپر کی سطروں میں واضح ہو چکا ہے کہ اسلامی تہذیب اپنے حال کی تعمیر میں "تاریخ کا تعین" کرتے وقت ارتقا پر مبنی زمانی ترتیب کی تاریخ کو ملحوظ نہیں رکھتی، بلکہ اس کی بنیاد اصولاً اور اصلاً دینِ اسلام پر ہوتی ہے۔ اب اگر کسی بھی دور میں اسلامی تہذیب اپنے حال کی تعمیر، دینِ اسلام پر قائم کرتی ہے تو وہ کسی بھی دوسرے دور میں کسی ایسی ہی تہذیب کی ہم سفر قرار پاتی ہے، کیونکہ دونوں کے "حال" کی تعمیر کی پشت پر یکساں اصول موجود ہوتے ہیں۔ یہ یکساں اصول یعنی قرآن و سنت، ایک طرف زمان و مکان کا لحاظ کیے بغیر، ہم سفر تہذیبوں کو ملت یا امت کے عظیم اجتماعی دھارے سے منسلک کر دیتے ہیں اور دوسری طرف کسی کی پیشوائیت کی ہر گنجائش کا بھی خاتمہ کر دیتے ہیں۔

اختتامی کلمات کی طرف بڑھتے ہوئے ہم گزارش کریں گے کہ آج ہمارے سامنے دو بنیادی سوال سینہ تانے کھڑے ہیں کہ کیا معاصر اسلامی تہذیب کے حال کی تعمیر و بنیاد، دینِ اسلام پر ہے، جس طرح ہمارے اسلاف نے اپنے زمانے میں اسلامی تہذیب کے حال کی بنیاد، دینِ اسلام پر رکھی تھی؟ اور کیا ہم نے تاریخی اسلام (Historical Islam) کو اپنے اسلاف کے مانند ہم سفری کے درجے میں رکھا ہے یا پھر اسے پیشوائیت کی مسند پر براجمان کر دیا ہے؟ ہمارے جوابات ہمیں مغربی تہذیب و دیگر تہذیبوں سے ممتاز کر کے داعیانہ مقام بھی عطا کر سکتے ہیں اور انھی تہذیبوں کی ہم سفری کے "شرف" سے بھی نواز سکتے ہیں۔

اسلام ایک ہمہ گیر انسانی تہذیب

سید ثاقب اکبر

اسلامی تہذیب کی بنیاد فطرت اور عقلِ انسانی پر ہے اور یہ کائنات کی فطرت سے ہم آہنگ ہے اور کائنات کی فطرت الٰہی فطرت کا پرتو ہے لہٰذا اس کے خلاف انسان اگر حرکت کرے گا تو وہ تہذیب اسلامی کے خلاف حرکت ہوگی جو فرد اور معاشرے کے لئے ضرر رساں ہوگی۔ انسان کے کسی بھی عمل اور سوچ کو انسانی معاشرے سے لاتعلق نہیں مانا جا سکتا، اسی طرح انسانی معاشرے کا مجموعی کردار بھی ہر فرد کے لئے تاثیر رکھتا ہے لہٰذا فرد اور معاشرہ ایک دوسرے سے ہرگز بے گانہ نہیں ہو سکتے۔ فرد معاشرے کے لئے ذمہ دار ہے اور معاشرہ فرد کے لئے۔ جب اسلام کا یہ تصور ہو تو پھر اسلامی تہذیب سے مراد ایک انسانی تہذیب ہے اور اسلام کی تعلیمات اور اقدار ساری انسانیت کے لئے سرمایہ اور ورثہ ہیں۔ اس پر کسی گروہ، نسل، علاقے یا قوم کی اجارہ داری کو درست تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے ہر وہ فکر اور ہر وہ کام جو انسانی فطرت اور عقل کی بنیاد پر معرضِ وجود میں آئے، اسلامی ہے اگرچہ اس پر اسلام کا لیبل چسپاں نہ بھی کیا گیا ہو۔ جب بھی غور اور مطالعہ کیا جائے گا ایسے فکر و عمل کو انبیاء الٰہی کی تعلیمات کا نتیجہ پایا جائے گا چونکہ تمام انبیاء کی تعلیمات بھی بشریت کا مشترکہ سرمایہ ہیں۔ انبیاء عقل و فطرت کے راستے پر انسان کو دعوت دیتے تھے اور اس راستے سے انحراف کے خطرناک عواقب و نتائج سے ڈراتے تھے لہٰذا تمام انبیاء ساری بشریت کے لئے محترم ہیں اور اسلام ان میں کسی تفریق کا روادار نہیں۔ قرآن نے اسی بات کو "ہم اس کے رسولوں میں کوئی تفریق نہیں کرتے"(۱) کہہ کر بیان کیا ہے۔ ان کی کتب پر ایمان کو ناگزیر قرار دے کر قرآن ان کی تعلیمات کی سچائی اور درستی کی تائید کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ سب انبیاء ایک ہی دین کے پیروکار اور مبلغ تھے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ قرآن نے تمام انبیاء کے نام نہیں لیے اور نہ روایات (بشمول اسرائیلیات) میں تمام انبیاء کے نام آئے ہیں۔ قرآن اور پیغمبر اسلامؐ کو اپنی تعلیمات کی وضاحت اور ماقبل انبیاء کی تائید نیز وضاحتی مثالوں کے لئے جہاں اور جب ضرورت پڑی کسی ایسے نبی کا تذکرہ فرمایا ہے جس سے مخاطبین اولین پہلے ہی سے کسی حد تک مانوس تھے اور حکمت کلام کا تقاضا بھی یہی تھا۔ اس لیے عرب سرزمین سے باہر بھی قدیم متون میں آج بھی الٰہی تعلیمات کی جھلک نظر آتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مصاحف آسمانی اور عظیم الٰہی انسانوں کی تعلیمات کی دستاویزات انسانی دست برد اور حوادثِ تاریخ سے محفوظ نہ رہ سکیں سوائے قرآنِ پاک کے جو خاتم النبیینؐ پر اتارا گیا، تاہم یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ قدیم مقدس کتابوں میں تمام تر تاریخی حادثات کے باوجود انبیاء کی بنیادی ترین تعلیمات موجود ہیں اور یہ تمام کتب ہم افق معلوم ہوتی ہیں۔ جب ہم اسلامی یا دینی تہذیب کی بات کرتے ہیں اور جب ہم اس کا رشتہ انبیاء اور ان کی تعلیمات سے جوڑتے ہیں تو درحقیقت ہم اس کائنات کی روحانی تعبیر کے بارے میں اپنی معرفت اور ایمان کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں گویا جو کائنات کو یک بُعدی دیکھتے ہیں ان کی معرفت کو ہم ناقص سمجھتے ہیں۔ اسی طرح جب ہم اسلامی تہذیب کو انسانی تہذیب کہتے ہیں تو ہم یہ بھی کہہ رہے ہوتے ہیں کہ ہم مرد اور عورت کو ایک حقیقتِ انسانی کے دو مظاہر اور عناصر سمجھتے ہیں جس کے بارے میں قرآن میں آیا ہے۔ ”ہم نے تمھیں نفسِ واحدہ سے پیدا کیا، پھر اُسے مرد اور عورت میں تقسیم کر دیا اور پھر اُن کے ملاپ سے، بہت سے مرد اور بہت سی عورتیں پیدا کیں۔“ (۲)

نیز جب ہم تہذیب انسانی کی بات کرتے ہیں اور اسلامی تہذیب کو انسانی تہذیب کہتے ہیں تو ہم کہہ رہے ہوتے ہیں کہ انسانی جوہر خلقتِ الٰہی ہے اور انسانی باطن جلوہ گاہِ اسماءِ الٰہی ہے، اسی لیے اسے اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاء کی تعلیمات کا مرکز تکریم آدمیت رہی ہے اور قرآن نے اس حقیقت کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر ”ہم نے بنی آدم کو تکریم و عزت عطا کی“ (۳)، ”ہم نے انسان کو بہترین صورت پر پیدا کیا“ (۴) اور ”میں نے اپنی روح میں سے اس میں پھونکا“۔ (۵)

یہاں پر یہ واضح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے فہم کے حوالے سے ایک مشکل اس کی یک بُعدی شناخت رہی ہے۔ کسی نے اسے احکام فقہی کے حوالے سے دیکھا، کسی نے علم کلام کی بحثوں میں اسے تلاش کرنے کی کوشش کی، کسی نے اسے حدود و تعزیرات کے قدیم کتابی تصورات کی عینک سے دیکھا۔ کسی نے اسے عبادات اور ذکر و فکر میں محدود جانا، کسی نے حکومت سازی کے پہلو سے سمجھا، کسی نے قرآنی بلاغت و اعجاز ہی کو اسلام کا سب کچھ جانا، کسی نے کفر و اسلام کے معرکہ ہائے بالسیف میں اسے تلاش کیا، کوئی ظواہرِ کلام سے چمٹ گیا اور حرفیت پسندی میں بند ہو گیا اور کوئی اسے پیغمبر اسلامؐ کے دور کے عرب کلچر سے ممتاز نہ کر سکا، قس علیٰ ھذا القیاس۔ ان میں سے ہر کسی کے پاس سچائی کا ایک پہلو موجود ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلام کو ایک ہمہ گیر انسانی اور الٰہی تہذیب کی حامل تعلیمات کا امین اور پرچم بردار جانا جائے جس نے مساوات و تکریم انسانی کا پیغام پہنچایا، جس نے قانونی مساوات پر زور دیا، جس نے عورت کو بھی مرد کے برابر انسانی شرف کا حامل قرار دیا، جس نے قبائل و شعوب کی بنیاد پر لڑنے والوں کو آدمیت کی لڑی میں پرو دیا، جس نے معاشی عدالت کے تصور کو پروان چڑھایا، جس نے گورے اور کالے میں فرق کو روا نہیں جانا، جس نے عرب و عجم کی تمیز کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا، جس نے حکمرانی کے انسانی و الٰہی تصورات کو اجاگر کیا، جس نے فطرت و عقل کے خزانوں کو دریافت کیا، جس نے تعلیم و تعلم کی فضا پیدا کی، جس نے دین میں اکراہ کی نفی کی، جس نے شرف انسانی کے دشمنوں کے خلاف جرأت و شہامت سے جہاد کو فروغ دیا، جس نے مذہب اور روایات کے نام پر بنائی گئی زنجیروں کو اتار

پھینکا، جس نے انسانوں کو عادت وروایت، رسم ورواج، آباء پرستی، اندھی تقلید اور جمود فکر سے نجات کا پیغام دیا۔ جس نے انسانی اخلاق کا ہمہ گیر اور کمال آفریں تصور دیا، جس نے دنیا کو آخرت کی کھیتی قرار دے کر ہر فکر وعمل کے دائمی اور لازوال اثرات کا تصور پیش کیا، جس نے انسانوں کو احترام باہم کا پیغام دیا، جس نے نیکی اور پرہیزگاری کی بنیاد پر باہمی تعاون کو معاشرے میں ہم کاری کی بنیاد قرار دیا، جس نے ماقبل کے سچے انسانوں اور ماقبل کی پاکیزہ عقلی تعلیمات کی نفی پر نہیں بلکہ ان کی تائید پر اپنی تعلیمات کی بنیاد رکھی اور انھیں اپنی جدوجہد کے لیے سرمایہ بنالیا، جس نے معاشرے میں موجود مفید روایات اور قوانین سے بھی استفادہ کیا اور جس نے امر ونہی کے تصور کو معاشرے کے عرف اور ضمیر انسانی کی آواز سے جوڑ دیا۔ کیا ایسی خصوصیات کے حامل اسلام کو مذکورہ بالا ابعاد وجہات میں سے کسی ایک میں مقید کیا جاسکتا ہے؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہے تو پھر ہم یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اسلام ایک ہمہ گیر انسانی تہذیب کا حامل ہے۔

۱۔ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (بقرہ:۲۸۵)

۲۔ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِbاسَآءً (نساء:۱)

۳۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىْۤ اٰدَمَ (بنی اسرائیل:۷۰)

۴۔ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ (تغابن:۳)

۵۔ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِىْ (ص:۷۲)

□□□□□

علامہ اقبال کا تصورِ تہذیب

پروفیسر کوثر مظہری

معاشرے میں تہذیبی وثقافتی اقدار کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ تہذیب کا تعلق خارجی رسم ورواج سے ہوتا ہے جب کہ ثقافت انسان کی باطنی فکر سے رشتہ ہموار کرتی ہے۔ مذہب اور تہذیب کا مادہ اگرچہ ایک ہے مگر اول الذکر عقیدے سے اور موخر الذکر انسانی کردار اور معاشرتی اقدار سے متعلق کردار ادا کرتی ہے۔ حالانکہ تہذیب میں موزونیت پیدا کرنے کا کام عقیدہ بھی کرتا ہے۔ جب ہم کسی آدمی کو مہذب کہتے ہیں تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس آدمی کے اخلاق واطوار، عقائد ورجحانات، لباس اور خورد ونوش یہاں تک کہ اس کے طرز گفتگو میں ایک طرح کی موزونیت اور توازن ہوگا۔

علامہ اقبالؔ کی شاعری میں قومی اور وطنی جذبات کے تحت در آنے والے تہذیبی عناصر دھیرے دھیرے کم ہوتے گئے اور اسلامی وملّی تہذیب وثقافت کے عناصر غالب آگئے۔ ان کی نظر میں سب سے مہذب انسان "مردِ مومن" ہوسکتا ہے۔

علامہ اقبالؔ کی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک سفر انگلستان سے پہلے یعنی ۱۹۰۵ تک اور دوسرا دور انگلستان سے واپسی کے بعد سے لے کر اواخر عمر تک۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے ان کی شاعری کو چار ادوار پر مشتمل بتایا ہے۔ پہلا دور ۱۹۰۰ پر ہی ختم ہو جاتا ہے جو بالکل ابتدائی دور ہے۔ مولانا غلام رسول مہر نے اس دور کی صراحت میں ابتدائی ایسے شعر بھی پیش کر دیے ہیں جو "بانگ درا" میں شامل نہیں ہیں۔

دوسرا دور ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۵ء تک یعنی 'ہمالہ' سے 'نیا شوالہ' تک ختم ہو جاتا ہے۔ اسی دور میں ہندوستانی بچوں کا گیت، ترانہ ہندی، ایک پہاڑ اور گلہری، گائے وغیرہ نظمیں کہی گئیں، جنھیں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستانی تہذیب وثقافت سے بہت متاثر ہیں۔ اس زمانے میں نیچرل شاعری اور منظر کشی پر زور تھا۔ نظم ہمالہ پوری کی پوری خوبصورت منظر نگاری کی مثال پیش کرتی ہے۔ صرف ایک بند دیکھیے:

لیلیٰ شب کھولتی ہے آکے جب زلفِ رسا
دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا
وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا
کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر

خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار کا

اقبال ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے قائل تھے اور وہ مذہب کی بنیاد پر ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی کی تفریق کو مٹا دینا چاہتے تھے۔ نظم "نیا شوالہ" کے یہ دو شعر دیکھیے:

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ وجدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

یہاں ایک طرح سے دیکھا جائے تو ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کے مذہبی ٹھیکے داروں کو ہدف بنایا گیا ہے۔ مگر یہاں اقبال جذباتیت سے مغلوب ہو گئے ہیں۔

البتہ جس محبت اور پریت کی بات کہی گئی ہے وہ تمام فرقہ والوں کو تہذیب اور تمدن کے اعتبار سے ایک جگہ لا کھڑا کرنے کی ترغیب دیتی ہے:

ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
شکتی بھی شانتی بھی، بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اس طرح ملک کی تعریف تاریخی پس منظر میں پیش کی گئی ہے۔ "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" کا ایک بند دیکھیے:

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

اگر تاریخی و تہذیبی پس منظر اور تلمیحات کی روشنی میں دیکھنا چاہیں تو اسی نظم کا ایک بند اور ملاحظہ کیجیے:

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا
سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا
ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

اقبالؒ نے اسلام کی روح کو سامنے رکھا۔ رنگ اور نسل کی تفریق، قوم اور وطن کی تفریق کو بنی نوع انسان کے لیے مہلک تصور کیا۔ جدید مغربی تہذیب وثقافت میں روحانیت کے فقدان کو اقبال نے سمجھ لیا۔ ان کی نظر میں صحت مند سیاست کے لیے بھی مذہب اور اخلاق لازمی عوامل ہیں۔ اسی کے تحت انھوں نے مغرب کی سیاست کو ایک دیو بے زنجیر سے تشبیہ دی ہے:

ہوئی ہے ترک کلیسا سے حاکمی آزاد
فرنگیوں کی سیاست ہے دیوِ بے زنجیر

معاشرے میں جو اخلاقی گراوٹ اور تہذیبی انحطاط کا دور شروع ہوا ہے وہ تہذیب فرنگی اور قلب وروح کے پاکیزہ نہ ہونے کے سبب ہے۔ اس ضمن میں علامہ اقبال کا فلسفہ دیکھیے:

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیر پاک، خیال بلند و ذوق لطیف
(مغربی تہذیب: ضربِ کلیم)

اس بات کی یہاں وضاحت ضروری ہے کہ اقبال کی شناخت اسی بنیاد پر ہے کہ انھوں نے اسلامی تہذیب وتاریخ اور مذہبی افکار کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ اخلاقی پہلو ہو یا سماجی اور سیاسی، رسم ورواج کا معاملہ ہو یا جمالیاتی اقدار کا، اجتماعی زندگی کا مظاہرہ ہو یا انفرادی کردار سازی کا، علامہ اقبال کی نظر ہمیشہ اسلامی افکار ونظریات سے رجوع کرتی ہے۔ قوموں کی پہچان تہذیب و تمدن سے ہی ہوتی ہے۔ تہذیبی اقدار میں تبدیلی زاویہ فکر میں تبدل کا باعث ہوتا ہے۔ اقبال کو سیاست سے کد کبھی نہیں رہی البتہ اس سیاست (مغرب کی سیاست) کو انھوں نے قوم اور معاشرے کے لیے مہلک اور باعث فساد تصور کیا ہے جس کی بنیاد مادیت اور بے ضمیری پر ہے۔ ۲۱ر مارچ ۱۹۳۲ کو لاہور میں مسلم کانفرنس کا انعقاد ہوا تھا۔ ان کا نظریہ وطنیت وقومیت یہاں صاف طور پر سامنے آگیا ہے:

سیاست کی جڑ انسان کی روحانی زندگی میں واقع ہوتی ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اسلام ذاتی رائے کا معاملہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک سوسائٹی ہے یا پھر CIVIC CHURCH۔ آج کل ہندوستان کے اندر سیاسی تصورات جو شکل اختیار کر رہے ہیں وہ آگے چل کر اسلام کی ابتدائی ساخت اور فطرت پر اثر انداز ہوں گے۔ میں یورپ کی وطنیت کا مخالف ہوں، اس لیے نہیں کہ اسے اگر ہند میں نشو ونما پانے کا موقع ملے تو مسلمانوں کو مادی فوائد کم ہوں گے۔ میری مخالفت تو اس بنا پر ہے کہ میں اس کے اندر ملحدانہ مادیت پرستی کے بیج دیکھتا ہوں، جو میرے نزدیک انسانیت کے لیے ایک عظیم ترین خطرہ ہے۔ حبّ الوطنی بالکل طبعی صفت ہے اور انسان کی اخلاقی زندگی میں اس کے لیے پوری جگہ ہے۔ لیکن اصل اہمیت اس کے ایمان، اس کی تہذیب اور اس کی روایت کو حاصل ہے اور میری نظر میں یہی اقدار اس قابل ہیں کہ انسان ان کے لیے زندہ رہے، اور ان ہی کے لیے مرے، نہ زمین کے اس ٹکڑے کے لیے جس سے اس کی روح کو عارضی ربط پیدا ہو گیا ہے۔" [1]

لہٰذا اخلاقی وتہذیبی اقدار کی اہمیت پر اقبال نے زور دیا ہے۔ محض زمین کا ایک ٹکڑا اہم نہیں جس سے عارضی طور پر کسی کو ربط پیدا ہو گیا ہے۔ حب الوطنی میں بھی نری حب الوطنی اہم نہیں۔ اقبال کو حب الوطنی کے نغمے گنگنانا ہمیشہ اچھا لگتا تھا۔ "ضربِ کلیم" اواخر عمر کی شاعری پر مشتمل ہے۔ اس میں اگر "شعاعِ امید" کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ انھیں آخر عمر تک ہندوستان کی دھرتی سے اور اس کی خاک سے اُنس تھا۔ مگر وہ جذبے سے مغلوب نظر نہیں آتے۔

"تہذیب و تمدن کی وہ بنیاد دنیا تھی جس کا ظہور رسول کریمؐ کی دعوت سے ہوا۔ میں چاہتا ہوں آپ اپنی نگاہیں ان تصورات پر رکھیں جو اسلامی تہذیب و ثقافت میں کارفرما ہے۔" [12]

اقبال کی نظم "روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" میں انسانی زندگی کے مقصد اور کائنات میں غور و فکر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک بند دیکھیے:

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایّام میں آج اپنی ادا دیکھ

اقبال یہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنی فکر کو ان تصورات پر مرکوز رکھے جو اسلامی تہذیب و ثقافت کی اساس ہیں۔ وہ تہذیبی ارتقا کے لیے "فقرِ غیور" کی اہمیت پر زور دیتے ہیں:

روحِ اسلام کی ہے نورِ خودی نارِ خودی
زندگانی کے لیے نارِ خودی نور و حضور
لفظ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر
دوسرا نام اسی دین کا ہے "فقرِ غیور"
(ضربِ کلیم سے)

علامہ اقبال کو یہ معلوم تھا کہ اگر قوم مسلم تہذیبِ فرنگی کی پیروی میں لگ گئی تو پھر ایک صالح اور مثالی معاشرے کی تعمیر نہ ہو سکے گی۔ ایسی صورت میں نسلِ انسانی کی بقا، فلاح و بہبود اور ترقی کی راہیں محفوظ و مامون نہیں رہ سکیں گی۔ اقبالؔ کے معاشرے میں جو بھی لوگ ہوں گے وہ عاشقانِ زندہ دل یا قلندرانِ حق آگاہ، اور یہی وہ لوگ ہوں گے جن کی بدولت اسلامی ثقافت اور تہذیب باقی رہے گی۔ جہاں متعصبانہ وطنی جذبہ اور نسلی و طبقاتی امتیاز ہو گا وہاں تہذیب و ثقافت کے عناصر روشن نہیں ہو سکیں گے۔ قرآن کریم کے مطابق اختلافِ لیل و نہار کو اللہ کی (ہر لحظہ جس کی ایک نئی شان ہے) ایک آیت (نشانی) تصور کرنا چاہیے۔ ابن خلدون اسلامی تہذیب و تمدن کی روح کو بخوبی سمجھ گیا تھا، یہی سبب ہے کہ قرآن کی روح جو سراپا یونانیت کے منافی تھی، حکمتِ یونان پر غالب آ گئی۔ یونانیوں کے نزدیک 'زمانہ' کی کوئی حقیقت نہیں جیسا کہ زینو اور افلاطون کا خیال تھا، یا یہ ایک دائرے میں گردش کرتا تھا،

جیسے ہندوؤں کا سنسار چکر۔

اقبال تہذیب مغرب کو مسلم معاشرے کے لیے سم قاتل سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ فرنگی تہذیب نے مسلم نوجوانوں کو ہوس ناکی اور خود فریبی و خود فروشی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ اقبالؔ نے لندن سے جب اپنے بیٹے کو منظوم خط لکھا تو اسی مشرقی تہذیب کی روح کو سمجھنے اور تہذیب فرنگ سے احتراز کی تلقین کی تھی:

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر
(جاوید کے نام: بالِ جبریل)

بالِ جبریل میں ہی ایک نظم ہے "ایک نوجوان کے نام"، جس میں تہذیب فرنگ، شکوہ خسروی اور استغنا، فقر سلطانی اور شاہین کے ذریعہ معاشرے کا مثالی فرد بننے کا پیغام دیا گیا ہے۔ ایک طرح سے فرنگی طرز زندگی کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے:

ترے صوفے ہیں افرنگی، ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا، شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل؟
نہ زور حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی
نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیب حاضر کی تجلی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی

سفر یورپ سے واپسی (۱۹۰۸) کے بعد ظاہر ہے کہ علامہ اقبال کی فکر میں ایک بڑی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ "بلاد اسلامیہ" ۱۹۰۸ء کے بعد کی نظم ہے جو بانگ درا میں شامل ہے، بلکہ ۱۹۰۸ء کے بعد والے حصہ میں یہ پہلی نظم ہے۔ ملت بیضا کی تہذیب کا نقشہ دیکھیے:

ہے زمینِ قرطبہ بھی دیدۂ مسلم کا نور
ظلمت مغرب میں جو روشن تھی مثل شمع طور
بجھ کے بزم ملت بیضا پریشاں کر گئی
اور دیا تہذیب حاضر کا فروزاں کر گئی
قبر اس تہذیب کی یہ سرزمین پاک ہے
جس سے تاک گلشن یورپ کی رگ نمناک ہے

یہاں شہر یثرب کا تاریخی پس منظر بھی پیش کیا گیا ہے۔ یہاں ایک اور نظم "تہذیب حاضر" کا حوالہ ضروری ہے جو فیضی کے اس

شعر پر تضمین ہے

تو اے پروانہ! این گرمی ز شمع محفلے داری
چو من در آتش خود سوز اگر سوز دلے داری
نظم 'تہذیب حاضر' کا یہ حصہ ملاحظہ کیجیے:
حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیب حاضر میں
بھڑک اٹھا بھبوکا بن کے مسلم کا تن خاکی
نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے
یہ رعنائی، یہ بیداری، یہ آزادی، یہ بیباکی
حیات تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا
رقابت، خود فروشی، ناشکیبائی، ہوس ناکی

علامہ کے نزدیک تہذیب انسانی میں استقرائی عمل اور مساوات کا بہت عمل دخل ہے۔ مساوات بھی زندگی کی اعلیٰ قدروں میں شامل ہے۔ "رموز بے خودی" میں اس پر تفصیلی بحث ملتی ہے۔ ظہور اسلام سے پہلے بادشاہ، کلیسا یا پروہت نے جو انسانیت کا استحصال کیا وہ عبرتناک ہے۔ اسلام نے تمام امتیازات ختم کر کے مساوات اور ہمہ گیر اخوت کا درس دیا:

قوت او ہر کہن پیکر شکست
نوع انساں را حصار تازہ بست
کل مومن اخوۃ اندر دلش
حریت سرمایۂ آب و گلش
نا شکیب امتیازات آمدہ
در نہاد او مساوات آمدہ

اقبال نے غلامی کرنے والوں کو "کتے" سے تشبیہ دی ہے۔ انھوں نے حریت یعنی آزادی کو اہم قرار دیا ہے۔ غلامی سے دل مردہ ہو جاتا ہے اور پھر روح ایک بوجھ بن جاتی ہے۔ غلامی سے ایک "مرد حق" بھی "زنار بند" ہو جاتا ہے۔ زبور عجم میں "بندگی نامہ" کا یہ ایک شعر:

از غلامی مرد حق زنار بند
از غلامی گوہرش ناارجمند

اقبال کی نظر میں غلام ایک "ممولہ" ہے اور آزاد شخص "شہباز" اور "شاہین" کی طرح ہے:

بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے
پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خوداک زندہ کرامات
محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی
موسیقی و صورت گری و علم نباتات

موسیقی اور صورت گری کی بات نکل آئی تو تہذیب جدیدہ سے متعلق علامہ اقبال کا نظریہ دیکھتے چلیں۔ فرنگی تہذیب میں رقص وموسیقی کو شان امتیاز تصور کیا جاتا ہے۔ نیم برہنہ ہو کر غیر مردوں کے ساتھ کمر لچکا کر ٹمیوں کا رقص کرنا فخر و انبساط کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ اقبالؔ اپنی قوم کو بدن کے رقص سے اعراض کرنے اور روح کے رقص کی تلقین کرتے ہیں:

چھوڑ یورپ کے لیے رقص بدن کے خم و پیچ
روح کے رقص میں ہے ضرب کلیم اللّٰہی
صلہ اس رقص کا ہے تشنگیٔ کام و دہن
صلہ اس رقص کا درویشی و شاہنشاہی!

(رقص: ضرب کلیم)

علامہ کو یہی غم لاحق ہے کہ تہذیب فرنگ کی تقلید ہندی بھی کر رہے ہیں اور عجمی بھی۔ گویا ہماری تہذیب وثقافت کی مشرقیت مفقود ہو چکی ہے۔ نظم "مصور" میں کہتے ہیں:

کس درجہ یہاں عام ہوئی مرگ تخیل
ہندی بھی فرنگی کا مقلد، عجمی بھی
مجھ کو تو یہی غم ہے کہ اس دور کے بہزادؔ
کھو بیٹھے ہیں مشرق کا سرور ازلی بھی

(مصور: ضرب کلیم)

معاشرے اور ماحول سے تہذیب وثقافت متاثر ہوتی ہے۔ پہلے صحت مند معاشرے کی تعمیر ضروری ہے اور صحت مند معاشرے کے لیے صحت مند افراد (معنوی اور ذہنی اعتبار سے) کی ضرورت ہے۔ اقبالؔ "جاوید نامہ" نظم میں صرف جاویدؔ سے نہیں، بلکہ پوری قوم کے جوانوں سے مخاطب ہیں:

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبت زاغ
حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

شاعر مشرق علامہ اقبال نے ماضی کی قدروں اور تہذیبی وثقافتی نشانیوں کو اپنی فکر کا حصہ بنایا تھا:

یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے
میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے

عہدِ رفتہ اور ماضی کی عظمت اور جلال و جمال کو اقبال اپنی سرشت کا حصہ تصور کرتے تھے۔ ثقافت (جس پس منظر میں اقبال بات کرتے ہیں) کا معیار جلال و جمال کی قوت پر ہے۔ ذوق و شوق اور فعل و قول میں توازن ہونا ہی تہذیب ہے۔ توازن کو سمجھنے کے لیے اقبال کی نظم جلال و جمال سے دو شعر:

مری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی
کہ سر بہ سجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک
نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر
ترا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتش ناک

جلال و جمال کے فلسفے کو سمجھنے کے لیے پروفیسر حمید احمد خان کی زبانی بیان کیا گیا واقعہ بھی دل چسپ اور تاریخی اہمیت کا حامل ہے:

"اندلس کی بعض عمارتوں میں بھی اسلامی فن تعمیر کی اس خاص کیفیت کی جھلک نظر آتی ہے (جسے علامہ اقبالؔ نے "مسجد قوت الاسلام میں "سنگینی" کہا ہے) لیکن جوں جوں زندگی کے قویٰ شل ہوتے گئے، تعمیرات کے اسلامی انداز میں ضعف آتا گیا۔ وہاں کی تین عمارتوں میں مجھے ایک خاص فرق نظر آیا "قصر زہرا" دیووں کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے، "مسجد قرطبہ" مہذب "دیووں کا، مگر "الحمرا" مہذب انسان کا۔" ۳۳

تاج محل سے متعلق اقبال کا ایک مکالمہ یوں ہے:

"مسجد قوت الاسلام والی کیفیت اس میں نظر نہیں آتی۔ بعد کی عمارتوں کی طرح اس میں بھی قوت کے عنصر کو ضعف آگیا ہے اور دراصل یہی قوت کا عنصر ہے جو حسن کے لیے توازن قائم کرتا ہے۔" ۳۴

مسجد کی تعمیر و تخریب اور پس منظر کو سامنے رکھ کر اقبال نے نظمیں کہی ہیں:

مری نگاہ کمالِ ہنر کو کیا دیکھے
کہ حق سے یہ حرمِ مغربی ہے بیگانہ
حرم نہیں ہے، فرنگی کرشمہ بازوں نے
تنِ حرم میں چھپا دی ہے روحِ بت خانہ

(پیرس کی مسجد: ضربِ کلیم)

مسلم تہذیب و ثقافت کو ہسپانیہ (اسپین) میں عروج حاصل رہا تھا۔ مگر جب راہ تنزل پر گامزن ہوئی تو عبرت ناک نقشہ سامنے آیا۔ اقبال کی نظم مسجد قرطبہ اسی تہذیبی و ثقافتی عظمت و جلالت کی علامت ہے۔ اقبال کی نظر میں اس مسجد کی تعمیر بذات خود ایک معجزہ کے مثل ہے جو پاکیزہ اور سچے عشق کا نتیجہ ہے۔ مسلم حکمرانوں، شہسواروں اور معماروں کی عظمت اور صلاحیت نیز پرشکوہ طرزِ زندگی اور

نظام حکومت کا ذکر پر خلوص جذبے کے ساتھ اس نظم میں کیا گیا ہے۔ یہ نظم مسلم قوم اور اسلامی تہذیب و ثقافت کی منہ بولتی تصویر ہے۔
اقبال نے اس مسجد کی تعمیر میں جلال و جمال، عشق صادق اور خون جگر کی آمیزش کو اہم قرار دیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

تیرا جلال و جمال مرد خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل

عشق اور خون جگر کی اہمیت ملاحظہ کیجیے:

عشق دل جبرئیل، عشق دل مصطفےٰ
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
اے حرم قرطبہ ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود
رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود

(مسجد قرطبہ: بال جبریل)

عشق کی بدولت اس مسجد کا اور اس سرزمین کا مرتبہ حرم شریف کے برابر ہو گیا ہے:

کعبۂ ارباب فن سطوتِ دین مبیں
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں

سرزمین اندلس پر اسلامی پرچم کا لہرایا جانا اپنے آپ میں ایک بڑا تاریخی کارنامہ ہے۔ مسلم حکومت کا حسن اخلاق، حسن تعمیر اور مختلف علوم و فنون میں دوسری قوموں کو فیض یاب کرنا، یہ بھی کسی معجزہ سے کم نہ تھا۔ اقبال کف افسوس ملتے ہیں اور آہ سرد بھرتے ہیں کہ ایک مدت سے یہ مسجد خستہ حال و بے اذاں ہے، نہ معلوم وہ عشق بلا خیز کا قافلہ کون سی وادی میں گم ہو گیا ہے۔
خون جگر کو اقبال فنون لطیفہ کی تمام شاخوں کے لیے اہم خیال کرتے ہیں۔ فن تعمیر ہو یا فن رنگ سازی، فن بت گری ہو یا فن شاعری، اگر خون جگر کی آمیزش اس فن میں ہے تو وہ فن عظیم ہے

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

''مسجد قرطبہ'' کے علاوہ انھوں نے ''ہسپانیہ'' کے عنوان سے جو نظم کہی وہ بھی اپنے شاندار ماضی کی بازگشت اور مسلم حکومت کے نقوش کی ترجمانی کرتی ہے۔ یہاں اس نظم سے تین اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

ہسپانیہ تو خون مسلماں کا امیں ہے
مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں
پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہے

خاموش اذانیں ہیں تری باد سحر میں
روشن تھیں ستاروں کی طرح ان کی سنانیں
خیمے تھے کبھی جن کے ترے کوہ و کمر میں

(ہسپانیہ: بال جبریل)

اقبال یہ سمجھتے تھے کہ اسلامی تہذیب وثقافت کے تحفظ کے لیے ملت اسلامیہ کا تحفظ لازمی ہے۔ کیوں کہ جب ملت کی ترکیب بگڑ جائے گی یعنی اجزائے ملت منتشر ہو جائیں گے تو ہماری حیثیت بھی صفر ہو جائے گی۔ دیگر اقوام مغرب کی طرح ہمارے اندر بھی نام و نسب اور ملکی سطح پر تفریق پائی جاتی ہے۔ ملت اسلامیہ کی جمعیت کا انحصار مذہب کی بقا پر ہے:

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

اقبال کے نزدیک احترام آدم ہی تہذیب کی روح ہے۔ اگر انسان میں یہ صفت پیدا ہو جائے تو اس کا مقام گردوں سے بھی فزوں تر اور بلند ہے:

بر تراز گردوں مقام آدمؑ است
اصل تہذیب احترام آدم است

وہ جو اجزا یا اشیا یا اسباب تفنن جن سے اخلاق و کردار متاثر ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں، اقبال کی نظر میں ضرب اخلاق کے زمرے میں آتے ہیں۔ تھیٹر اور سنیما بھی تفریح اور تفنن طبع کے لیے بنائے گئے ہیں۔ اقبالؒ نے سنیما کو صنعت آزری کہا ہے ساتھ ہی آزری کو شیوہ کافری سے تشبیہ دی ہے اور اسے تہذیب حاضر کی سوداگری بھی کہا ہے:

وہی بت فروشی وہی بت گری ہے
سنیما ہے یا صنعت آزری ہے؟
وہ صنعت نہ تھی شیوۂ کافری تھا
یہ صنعت نہیں شیوۂ ساحری ہے
وہ مذہب ہے اقوام عہد کہن کا
یہ تہذیب حاضر کی سوداگری ہے
وہ دنیا کی مٹی، یہ دوزخ کی مٹی

وہ بتخانہ خاکی، یہ خاکستری ہے

مغربی تہذیب اور نقش فرنگ کے ذیل میں آنے والی تمام چیزیں اور تمام عمل علامہ اقبال کی نظر میں عزب اخلاق و اطوار ہیں۔فرنگیوں کا مقصد حیات تفریق ملل ہے جب کہ مذہب اسلام کا مقصد فقط ملت آدم ہے۔وہ سمجھتے ہیں کہ اقوام مغرب کے جال میں آ کر ملت اسلامیہ اپنی تہذیبی شناخت کھو بیٹھی ہے۔ اقبال بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

ضمیں نہ ہو کہ پراگندہ ہے شعور تیرا
فرنگیوں کا یہ افسوں ہے، قم باذن اللہ
(قم باذن اللہ)

زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر
یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لب گور
(اقوام مشرق)

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف
(دین و تعلیم، ضرب کلیم)

نظام معاشرہ کی ایک اہم اکائی "عورت" ہے۔تہذیب مغرب میں عورت بازار کی زینت بنا دی گئی جس کے سبب ایک طرح کا فساد اس روئے زمیں پر ہمیشہ برپا رہا ہے:

فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور
کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں
(مرد فرنگ: ضرب کلیم)

عورت کی نسوانیت کا تحفظ مرد پر لازم ہے۔مگر شیطان کے پنجاریوں نے عورت کو محض جنسی تلذذ کا آلہ کار تصور کیا جو دراصل تہذیب انسانی اور اخلاقی معیار کے منافی ہے۔اقبال کہتے ہیں:

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے
ہند و یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال
مرد بیکار و زن تہی آغوش
(ایک سوال: ضرب کلیم)

اقبال کے نزدیک پوری مغربی تہذیب اور دانش فرنگ مشرقی تہذیب اور معاشرے کے لیے زہر کے مترادف ہے۔ اقبال تسلیم کرتے ہیں کہ:

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں

(عورت: ضرب کلیم)

مگر عورت کی آزادی اور ایسی تعلیم جس سے نسوانیت مجروح ہوتی ہو، اقبال کی نظر میں لائق اعتنا نہیں:

نے پردہ نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد

اقبال کی چشم بصیرت کے لیے مدینہ و نجف کی خاک مثل سرمہ ہے۔ یورپ کی جلوہ سامانیاں اور وہاں کے میخانے اور بتکدے علامہ اقبال کو مسحور و مخمور نہ کر سکے، کیوں کہ اقبال کا شعور چوکنا تھا اور ان کی فکر اسوۂ حسنہ سے ہم آمیز تھی۔ انھیں معلوم تھا کہ مغربی تہذیب اور یہ عارضی چمک دمک کھوکھلی اور نمائشی ہے:

وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پرکار و سخن ساز ہے نمناک نہیں ہے

(غزل۔۱۰، بال جبریل)

میخانۂ یورپ کے دستور نرالے ہیں
لاتے ہیں سرور اوّل دیتے ہیں شراب آخر

(غزل۔۲۹، بال جبریل)

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

(غزل۔۱۶، بال جبریل)

مشینی تہذیب و حکومت اور مختلف علوم و فنون اور ایجادات کے باوجود فرنگی مدنیت میں عریانیت اور افلاس، بیکاری اور جھوٹے مساوات کا جھوٹا دعوا دیکھنے کو ملتا ہے۔ اقبال بہ زبان لینن اسرار کھولتے ہیں:

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
یہ علم یہ حکمت یہ تدبّر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہے فرنگی مدنیت کے فتوحات
ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

(لینن خدا کے حضور میں: بالِ جبریل)

بالِ جبریل سے بہت پہلے کی ایک نظم "مارچ ۱۹۰۷" کے عنوان سے ہے جو "بانگِ درا" میں شامل ہے۔ اقبال اس وقت یورپ میں تھے اور وہاں کی کھوکھلی اور کمزور تہذیب کا بغور مشاہدہ کر رہے تھے۔ ملّی احساس میں استحکام پیدا ہو چلا تھا۔ نظم کا یہ حصہ دیکھیے:

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

علامہ اقبالؔ کی فکر نے یوں کروٹ بدلی کہ گویا سب کچھ بدل گیا اور یورپ کی ننگی تہذیب کو دیکھ کر انھیں احساس ہو گیا کہ یہ مذہب اسلام کا غارت گر ہے اس لیے انھوں نے نظم "وطنیت" میں مذہبِ اسلام کو وطن (دیس) قرار دیا اور توحید کو اس کے استحکام و استقرار کا ذریعہ بتایا۔ اقبالؔ کا یہ نظریہ بھی سامنے آیا کہ "ترکِ وطن" "سنتِ محبوبِ الٰہی" ہے۔ سیاست میں وطن کا جو تصور ہے وہ ارشادِ نبوی سے جداگانہ ہے۔ سیاسی طور پر وطنیت سے پوری دنیا میں رقابت ہے، ساتھ ہی اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس سے قومیت اسلام اور مسلم تہذیب کی جڑ کھوکھلی ہوتی ہے۔ اس نظم سے ایک بند پیش کیا جاتا ہے:

یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفویؑ خاک میں اس بت کو ملا دے

(وطنیت: بانگِ درا)

پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

"انھوں نے پہلی دفعہ یوروپین سیاست کی بازی گری دیکھی۔ وہاں کی تمدنی زندگی کی گہرائی اور کھوکھلے پن کا مشاہدہ کیا، فرنگیوں کے اصولِ زندگی کی ظاہری و باطنی کیفیات پر نگاہ ڈالی، مختلف قوموں کی وہ آویزش دیکھی جو ایک دوسرے پر قابو پانے کے لیے ان

کے درمیان جاری تھی۔ وطنیت اور نسل پرستی کا وہ بڑھتا ہوا طوفان نگاہوں کے سامنے آیا جو دوسروں پر عرصۂ زندگی تنگ کر دینا چاہتا تھا۔" ۵

پروفیسر احتشام حسین نے اقبال کے اندر آئی تبدیلی کے اسباب کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اقبال صالح تہذیب و معاشرے کے لیے مذہبی افکار اور معیاری اخلاق کے عناصر کو ضروری سمجھتے تھے۔ یورپ کی تہذیب نے جو فکری اور جنسی انتشار کا ماحول پیدا کیا ہے، یورپ جو مشینوں کو اپنا سہارا سمجھتا ہے اقبال کی نظر میں ابلیس ہے۔ یہ دنیا ایسی ہے جہاں روح اور بدن میں معرکہ درپیش ہے:

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

تہذیب مغرب کے درندوں سے لوہا لینے کے لیے اتحاد عالم اسلامی کی ضرورت ہے۔ لادینی اور مادیت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا یہی راستہ ہے۔ اقبال اسی لیے جمال الدین افغانی (۱۸۹۷ء۔ ۱۸۳۸ء) کے نظریہ اتحاد عالم اسلامی کے حامی تھے مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ حب الوطنی کے جذبے کو کچل کر حب دین تھوپ دیا جائے۔ اس اتحاد کو اقوام مغرب نے Pan Islamism سے موسوم کیا اور اسے مشتری بھی کہا گیا۔ اس کی تصریح و تعبیر "سب کچھ اسلام" یا "اسلام ہی اسلام" جیسے لفظ سے کی گئی۔ مغربی میڈیا نے عوام کو یہ کہہ کر ورغلایا کہ مسلمان پوری دنیا پر اسلام کو مسلط کر دینا چاہتے ہیں۔ اقبالؔ نے اخباروں میں کئی بیان جاری کیے:

"پین اسلامزم کا لفظ فرانسیسی صحافت کی ایجاد ہے اور یہ لفظ ایسی مفروضہ سازش کے لیے استعمال کیا گیا تھا جو اس کے وضع کرنے والوں کے خیال کے مطابق اسلامی ممالک غیر اسلامی اقوام خاص کر یورپ کے خلاف کر رہے تھے...... وہ اپنے آپ کو ایک علاحدہ معاشرتی جماعت کی حیثیت سے قائم رکھنا چاہتے ہیں......" ۶

علامہ اقبال نے ایسی قومیت کے خلاف آواز بلند کی جس کی بنیاد مذہبی قدروں، اخلاقی ضوابط اور ثقافتی روایات کے تحفظ کے احساس کے بدلے ایسے جذبوں کی تسکین پر رکھی گئی ہو جو کسی خطۂ زمین میں رہنے کے سبب وہاں کے باشندوں میں عارضی طور پر پیدا ہو جاتے ہیں۔ مولانا حسین احمد مدنی کے تصور وطن کو اقبال نے اسی لیے رد کر دیا تھا:

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست
سرود برسر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمدؐ عربی ست

ملت جو خود ایک نظام حیات رکھتی ہے، وطنیت سے کسب روح کر کے غذا نہیں حاصل کر سکتی۔ ایسی قومیں جن کی تہذیبی و ثقافتی زندگی غیر صالح اور جن کی بنیاد حقائق کے بدلے شر و روخباثت پر تھی، وہ آہستہ آہستہ زوال کا شکار ہو گئیں۔ اس کا ذکر قرآن مقدس کی

سورہ الحج اور سورہ الرعد میں ہوا ہے۔ وہ ملّی تہذیب و ثقافت کو عظیم اور مستحکم کرنے کے لیے افراد معاشرہ کی ذہن سازی ضروری سمجھتے تھے۔ حرکت و عمل، پاکبازی، ضبط نفس، ہمہ گیر اخوت و محبت، جرأت پرواز کا تصور ملت کی تہذیبی و ثقافتی اساس کے لیے لازمی خیال کرتے تھے۔ مدرسوں، مکتبوں سے قوم و ملت اور اس کی تہذیبی بنیاد کو جو نقصان ہوا اس کا ذکر یوں کرتے ہیں:

یہ بتان عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ نہ تراش آذرانہ
شکایت ہے مجھے یارب خداوندان مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا
اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غم ناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ
کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

علامہ اقبال معاشرے اور جس تہذیبی فضا کی بات کرتے ہیں وہ تبھی ممکن ہے جب افراد معاشرہ میں مومن کی شان پیدا ہو جائے۔ اور اس صفت کی تعمیر خودی اور صفت استغنا سے ممکن ہے۔ تہذیب حاضر سے نوجوانوں کو وہ اس لیے دور ہی رکھنا چاہتے تھے۔ ''ایک نوجوان کے نام'' کا یہ حصہ دیکھیے:

نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیب حاضر کی تجلّی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراج مسلمانی
نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

استغنا کو معراج مسلمانی کہا گیا۔ استغنا سے خودی مستحکم ہوتی ہے جس کی بدولت قوت ارادی اور حرکت و عمل کی تشویق ہوتی ہے اور اسلامی تہذیب و ثقافت بھی پروان چڑھتی ہے۔ لہٰذا ہم یہ دیکھتے ہیں اقبال کی فکر جامد نہیں بلکہ مدور سفر پر جاری ہے۔ ان کی فکر رسمی حسن و عشق سے چل کر وطنیت، قومیت، شعور ملی، فلسفہ عقل و عشق، فلسفہ حرکت و عمل اور فلسفہ خودی تک پہنچتی ہے۔ خودی کا حصول معراج انسانیت ہے اور یہی معراج انسانیت اسلامی تہذیب و ثقافت کو فروغ دیتی ہے۔ اقبال مغربی طرز حیات اور تہذیبی چمک دمک کو معاشرے بالخصوص مسلم معاشرے کے لیے مہلک تصور کرتے تھے۔ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اقبال کی نظموں میں جو تہذیبی و ثقافتی تلازمے اور عناصر ملتے ہیں ان پر اسلامی اور مسلم افکار و نظریات کی چھاپ ہے۔

□□□□□

جدید اسلامی تمدن اور ایران

احمد رضوی

اس تحریر کا ہدف بھی اسلامی انقلاب کے سپریم لیڈر کے بلند افکار اور نظریات میں اسلامی تہذیب کے اہداف کو سمجھنا ہے لیکن اس ہدف کے بارے میں کچھ بیان کرنے سے پہلے موضوع کے بارے میں عرض کرتا چلوں، ایک ایرانی مفکر اور "معرفت جاودان" کتاب کے مصنف سید حسین نصر اپنی اس کتاب میں اسلامی تمدن اور ایران کے بارے میں لکھتے ہیں: "ایران کا اسلامی انقلاب، جدید اسلامی تہذیب کا نقطہ آغاز ہے، ایرانی اسلامی انقلاب ماضی کے تجربات، فتوحات اور شکستوں سے سبق حاصل کرکے ایک منصوبہ بندی کے تحت آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔" اس تعریف کو شاید انھوں نے آیت اللہ خامنہ ای کی نئی اسلامی تمدن کے معنی اور وضاحت سے اخذ کیا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں: نئی اسلامی تہذیب کا مطلب ہمہ جہت ترقی ہے اور اگر ہم اس کی عینی اور خارجی مصداق کو دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں نئی اسلامی تمدن کی تشکیل کو ایران کے اسلامی انقلاب کا ہدف قرار دینا ہوگا۔ لہٰذا، نئی اسلامی تمدن اور ہمہ گیر ترقی کے اس مفہوم کے مطابق ہم مسلم اقوام کے درمیان رسوم و رواج، عقائد، روایات، اسلامی علوم اور مشترکہ مادی اور روحانی وسائل کے مجموعے کا نام دے سکتے ہیں، جس کا نقطہ آغاز ایران میں انقلاب اسلامی ہے۔ پس اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلامی ایرانی تمدن سے ہماری مراد، وہی جدید اسلامی تمدن ہے جس کو ایران کے سپریم لیڈر آیت اللہ خامنہ ای نے امت مسلمہ پر سے ناقابل شکست اور مرکزیت کے حصول کا ذریعہ قرار دیا ہے۔

اسلامی انقلاب کے رہبر اسلامی تمدن کی تشکیل میں اپنے مدعا کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ہمارا مدعا روحانیت، وحی، تعلیمات آسمانی اور الٰہی ہدایت پر مبنی تہذیب کی تشکیل ہے۔ لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ کوئی بھی معاشرہ دولت اور طاقت پر بھروسہ کرکے اپنی خواہشات اور جبلتوں کے حصول کے لیے ایک خوشحال زندگی تو مہیا کر سکتا ہے لیکن نئی اسلامی تہذیب، ان سب کے علاوہ، مکتب اور ایمان کے روحانی پہلوؤں پر استوار، روحانی وسائل کے سائے میں ایک امت واحدہ، ایک قیادت اور مرکزی طاقت کا حصول بھی ہے۔

یہ کہنا ضروری ہے کہ نئی اسلامی تہذیب و تمدن کا تعلق کسی مخصوص نسل یا قوم سے نہیں ہے، بلکہ یہ موضوع ایک وسیع تہذیب کی تشکیل کا نام ہے جس میں تمام نسلی اور قومی گروہ شامل ہیں تاکہ وہ عالم اسلام کی سربلندی، ترقی اور توسیع اس میں اپنا کردار ادا کریں۔

اسلامی تمدن کے تعریف کو بیان کرتے ہوئے عظیم اسلامی لیڈر آیت اللہ علی خامنہ ای نے اسلامی تمدن کو ایک ایسا ماحول قرار دیا جس میں انسان روحانی اور مادی طور پر ترقی کر سکتا ہے اور مطلوبہ اہداف جن کے لئے اللہ تعالی نے اس کی خلقت کی ہے تک پہنچ سکتا ہے۔

آپ نے اسلامی بیداری کو اسلامی دنیا کے روشن مستقبل اور جدید اسلامی تہذیب کی طرف پہلا قدم قرار دیتے ہوئے اسلامی

دنیا کو ایک بار پھر اپنے عروج کو حاصل کرنے کی نوید سنائی: خوش قسمتی سے آج اسلامی دنیا میں بیداری وجود میں آ چکی ہے، حالانکہ غرب نے اس بیداری کو جھٹلانے کی کوشش کی ہے۔ مغربی ایشیا کے اس خطے اور شمالی افریقہ اور عرب ممالک میں جو کچھ ہوا وہ ایک اسلامی بیداری تھی۔ یہ ایک بیداری ہے، یہ بیداری پوری اسلامی دنیا میں موجود ہے۔ نوجوانوں کے پاس سوالات ہیں، وہ سوالات پوچھنا چاہتے ہیں اور وہ اسلام سے اپنے سوالات کے جوابات سننا چاہتے ہیں۔ وہ اسلام سے توقع رکھتے ہیں اور اسلام کی طرف مائل ہیں۔ غرب نے اسلام کے خلاف اور اسلامی زندگی اور سبک اسلامی کے خلاف جتنے پروپیگنڈے کیے، اس کے باوجود اسلام کی طرف بہت زیادہ رجحان ہے؛ یہ رجحان ہمیں نوید دیتا ہے کہ انشاء اللہ اسلامی دنیا کا کل، آج سے بہت بہتر ہے۔ عالم اسلام ان شاء اللہ وہ دن دیکھے گا جب ملت اسلامیہ اپنی تہذیب اور تمدن کے عروج پر ہوگی اور اسلام کے دشمن، امریکہ اور امریکہ جیسے جابر اور غاصب پر اسلامی ممالک کے حکمرانوں کو یہ حکم نہیں دے سکیں گے کہ آپ کو یہ کرنا چاہیے اور آپ کو وہ کرنا چاہیے۔ یہ [صورتحال] موجود ہے، جی ہاں بدقسمتی سے یہ صورتحال بعض ممالک میں آج بھی موجود ہے اور انشاء اللہ یہ حل ہو جائے گا، اور اسلامی دنیا خدا کے فضل اور خدا کے حکم سے اپنے عروج پر پہنچ جائے گی۔

ایران کے سپریم لیڈر آیت اللہ خامنہ ای نے نئی اسلامی تہذیب کے حصول کے لیے تمام ماہرین تعلیم، مدرسین، محققین اور علماء سے کردار ادا کرنے کی اعانت، طلب کرنے کے ساتھ، ان تمام افراد کو اس اہم مسئلے میں ذمہ دار ٹھہرایا ہے لہذا تمام مسلمانوں کو امت اسلامیہ کی خدمت کے اس راہ میں اور ایک امت واحدہ کے تشکیل کو ممکن بنانے میں چھوٹا سا ہی سہی اپنا حصہ ڈالنا چاہیے تاکہ مسلمانان عالم ایک بار پھر باہمی اتحاد و یکجہتی اور اپنے مثالی و ناقابل شکست تمدن سے ایک عظیم عالمی حکومت کو تشکیل دے سکیں۔ کیونکہ نئی اسلامی تہذیب و تمدن کا تعلق ایران سے نہیں بلکہ عالم اسلام سے ہے اور ایران کا اسلامی انقلاب صرف اس کا نقطہ آغاز ہے۔

اس مقدس ہدف کا حصول یقیناً ہم سب کو اس بات کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ اس تک پہنچنا چند ایک مراحل کو طے کرنے کے بعد ہی ممکن ہے۔ اس حوالے سے کچھ نکات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اسلام اور اسلامی حکومت کے قیام سے محبت کرنے محققین اور مفکرین کا فرض ہے کہ ان موضوعات کو وسعت دے کر اس پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

سب سے پہلے ہمارے ہاں جو المیہ ہے وہ یہ ہے کہ ہم اپنی ذات تک اور اپنے شخصی فائدے کو مدنظر رکھتے ہوئے تمام فیصلے کرتے ہیں اور اس کو گناہ تو دور غلط بھی تصور نہیں کرتے، ہمیں یہ احساس نہیں کہ کسی شخص کو رہبری اور ملکی سربراہی کے لیے انتخاب کرنے میں ہماری ذمہ داریاں کیا ہے؟ ہم کسی بھی شخص کو کیوں ووٹ دیتے ہیں؟ کیا ہمارا شرعی فرض یہاں پورا ہو جاتا ہے کہ ہم ایک ایسے شخص کو انتخاب کریں کہ وہ روزمرہ کی اشیاء کو سستے داموں فراہم کرے؟ یا ہمارے شہر اور گاؤں کے سڑکوں، گلیوں اور محلوں کو تعمیر کروائے؟ میرے بیٹوں کو نوکری فراہم کرے؟ یا انتخاب کرتے وقت میری چند ہزار روپے کی مشکل کو برطرف کرنے کے لیے میری مدد کرے؟ ہمارا ہدف کیا ہے؟ کس میزان پر کسی کو انتخاب کرنا چاہیے؟ اس کا یہ ہرگز یہ مطلب نہیں کہ یہ چیزیں غیر ضروری ہیں نہیں یہ سب زندگی کا حصہ ہے یہ ہونی چاہیے لیکن کیا انسانی زندگی کا ہدف یہ ہے؟ اصل سوال یہ ہے کہ کس ہدف کو حاصل کرنا ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لیے کون سا رہبر یا کون سا حکمران ہماری مدد کر سکتا ہے؟ یا حتی شخصیتوں اور حکمرانوں سے بالاتر ہو کر کیا موجودہ حکومتی نظام ہمیں اس ہدف تک پہنچا سکتا ہے؟ کیا نافذ نظام سے زندگی کے اس مقصد تک جس کے لیے انسان کی تخلیق ہوئی ہے پہنچ سکتے ہیں؟ کیا یہ ایک مطلوب اسلامی نظام حکومت ہے؟ ان تمام سوالوں کے جوابات اور اس اصلی ہدف کا حصول ہمیں جدید

اسلامی تمدن کے عناصر میں ملتا ہے جس کو ایرانی اسلامی انقلاب کے رہبر نے اپنے مختلف بیانات میں ذکر کیا ہے۔ ان میں چند ایک اہم عناصر کی طرف ہم یہاں اشارہ کرتے ہیں:

اسلام اور توحیدی اقدار پر اعتقاد:

آیت اللہ خامنہ ای توحید اور ایک خدا پر ایمان کو جدید اسلامی تمدن کی ثقافت کے بنیادی عناصر میں سے سمجھتے ہیں جو پوری اسلامی دنیا کی اساس اور ماہیت ہے جس میں جہان کا خالق اور وجود دینے والا ایک خالق قادر حکیم اور مدبر ہے جس نے اس جہان کو ایک خاص مشیت اور حکمت کے تحت پیدا کیا لہذا جدید اسلامی تہذیب کا ایک ستون، توحید پر نظریاتی اور عملی عقیدہ ہے جو انسان کو اندرونی قوت دیتی ہے اور اسے استوار رکھتی ہے انسان کو سکون، خود اعتمادی، امید، درست اور موثر نگاہ عطا کرتی ہے۔ اسلام میں توحید کا عقیدہ انسانی زندگی، تمدن اور متعالی ثقافت کی سنگ بنیاد ہے۔ جیسا کہ رہبر انقلاب اسلامی آیت اللہ خامنہ ای کہتے ہیں: سب سے پہلے، جدید اسلامی تمدن کی ضرورت ایمان ہے۔ ہم، اسلام کے ماننے والوں نے، یہ عقیدہ پایا ہے اور ہمارا ایمان، اسلام پر ایمان ہے۔ اسلامی تمدن میں یہ قدرت موجود ہے کہ وہ ایمان، علم، اخلاق، مسلسل جدوجہد، اعلی اخلاق اور بلند پایہ فکر، اسلامی امت اور پوری انسانیت کو تحفتاً پیش کرے اور مادہ پرستی اور جابرانہ عالمی نظریہ اور برے اخلاق سے جو مغرب کی تہذیب کی شناخت آزاد کرے۔

قرآنی اصولوں پر توجہ: اسلام کی طرف لوٹنا اور قرآنی اصولوں اور معاملات پر توجہ، اسلامی تمدن کی جدیدیت اور اسے توسیع دینے کے لیے سب سے اہم عنصر اور حکمت عملی ہے۔ اسلامی تمدن کی اصلی بنیاد، اس کی اسلامیت ہے اور اسلام اسلامی ثقافت کی اساس ہے۔ رہبر معظم نے جدید اسلامی تمدن کی تشکیل میں امت کا قرآن سے رابطے کو پہلا قدم قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے: وعدہ الٰہی کی مکمل تکمیل یعنی باطل پر حق کی فتح اور جدید اسلامی تمدن اور قرآنی قوم کی تعمیر نو کا تحقق راہ میں ہے۔

ان کے مطابق جدید اسلامی تہذیب کی تشکیل تمام اسلامی مذاہب کے مشترکہ اصولوں کی بنیاد پر ہونی چاہیے نہ یہ کہ شیعہ ایران کی بنیاد پر اور ظاہر ہے کہ تمام اسلامی فرقوں میں مشترکہ اور سب سے پہلا عالی ترین منبع، قرآن عظیم ہے۔

مجاہدت: تمام تہذیبی تحریکوں میں ایک بنیادی خصوصیت کوشش اور مجاہدت کو حاصل ہے۔ اس سلسلے میں سپریم لیڈر کا کہنا ہے: مستقل جدوجہد کی بدولت تمام تہذیبیں ممکن ہوئی ہیں۔

جدیدیت: یہ اسلامی ستون اس معنی کی تصدیق کرتا ہے کہ اسلامی تمدن، جبکہ اصل اقدار، اصولوں، کتاب اور روایت کی پاسدار رہے اور تحجر اور تعصب سے دور رہو۔ آیت اللہ خامنہ ای کے نقطہ نظر سے: زندگی کے نئے شعبے کھولنے کے لیے حقیقی جدیدیت اسلام کے لیے مطلوب ہے اور یہ وہی ہے جو انسان کو غور و فکر، تعمق، صداقت، فکرمندی، عملی کاوش، جدوجہد اور عظیم سعی کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔

استقلال:

استقلال اور خود انحصاری کی اصل قرآن سے ثابت ہے اور مسلمانوں کو قرآن کی اس آیت کو اپنا منشا قرار دینا چاہیے جس میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَنْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا۔

اور اللہ کافروں کے لیے مومنوں پر ہرگز کوئی راستہ نہیں بنائے گا (ترجمہ عبدالسلام بھٹوی-سورۃ النساء آیت 141)

اس آیت کی تفسیر میں مولانا حنیف ندوی اپنی تفسیر سراج البیان میں لکھتے ہیں: "ولن یجعل اللہ للکفرین علی المؤمنین سبیلا" میں مسلمان کے دائمی غلبہ وتسلط کا اعلان ہے یعنی حجت وبراہین سے لے کر قوت ومنفعت کے تمام ذرائع تک مسلمان کے قبضہ میں ہیں۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ ابدا کفرونفاق پر غالب وقاہر رہے گا، اس کی قوتیں بے پناہ اور غیر محدود ہیں۔ وہ دنیا میں ایک لحہ غلامی کے لیے آمادہ نہیں۔ آزادی وخلافت اس کی وفادار کنیزیں ہیں، مگر اس وقت جب اس کا ایمان صحیح معنوں میں ایمان ہو، جب اس کے ایمان کی درخشانی والمعانی چاند اور سورج کو شرمائے جب اس کے ایمان کی حرارت اس کے سینے میں ہمیشہ سوزان وتپاں رہے اور جب اس کے بازو میں قوت حیدری (رض) اور زورِ عمر (رض) موجود ہو، نہ اس وقت جبکہ ایمان کی روشنی کفر کی ظلمت کے مشابہ ہوجانے اور نہ اس وقت جب اس کی حرارت کفر کی برودت سے بدل جائے اور نہ اس وقت جب بازو شل ہوجائیں اور قوت جواب دے جائے۔

جدید اسلامی تمدن کے ایک دوسرے ستون کی حیثیت سے استقلال کا مطلب یہ ہے کہ بنیادی طور پر اسلامی تمدن ذلت، انحصار اور تقلید کی شرائط میں حاصل نہیں کی جاسکتی۔ لہذا، جدید اسلامی تمدن کی طرف بڑھنے کے لیے، غیر ملکیوں کی تقلید سے دور رہ کر عزت اور وقار سے آگے بڑھنا چاہیے۔

ثابت قدمی اور مقاومت:

ثابت قدمی کا مطلب ہے اپنا راستہ نہ کھونا۔ مادی اثرات سے دھوکہ نہ کھانا؛ خواہشات اور خواہشات کے اسیر نہ ہونا؛ اسلام کے اخلاقی، روحانی اور شائستہ احکامات اور فرائض کو ترک نہ کرنا اور خودغرضی اور لذت کی طرف متوجہ نہ ہونا۔ یہ بنیادی باتیں ہیں۔ یہ کہنا ضروری ہے کہ اسلام کے اعلیٰ مقاصد کے حصول، سپر پاورز کے خلاف استقامت ومقاومت اور مظلوموں اور مستضعف لوگوں کا دفاع ضروری ہے۔

یہ عالمی سطح پر ہے۔ یہ استقامت اور مزاحمت کا راستہ ہے جو پوری دنیا میں اسلامی تہذیب اور قرآن کا پرچم بلند کرے گا۔

انصاف اور جمہوریت حقیقی معنوں میں انسانی وقار اور آزادی اس کی مدد سے حاصل ہوگی اور یہ وعدہ الٰہی ہے:

خدا تعالیٰ نے ایک قطعی وعدہ کیا ہے کہ: "جو لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا رب ہمارا خدا ہے، پھر سیدھے کھڑے ہوگئے، ان پر فرشتے نازل ہوں گے لیکن خوف اور غم نہ کرو۔"

راہ راست پر استقامت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان اور معاشرے سے غم اور خوف کو دور کرتا ہے اور کامیابی انہیں دیتا ہے ہم نے جو راستہ چنا ہے وہ خدا کا راستہ ہے۔

قرآن میں خداوند متعال فرماتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ

بے شک وہ لوگ جنھوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے، پھر خوب قائم رہے، ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور اس جنت کے ساتھ خوش ہوجاؤ جس کا تم وعدہ دیے جاتے تھے۔ (ترجمہ عبدالسلام بھٹوی-سورہ فصلت-آیت 30)

قدیم اور معاصر تہذیبیں نیز جدید اسلامی تہذیب

سید احمد رضا زیدی

جب ہم قدیم تہذیبوں کی بات کرتے ہیں تو ہمیں یہاں بھی سب سے قدیم تہذیب اسلامی ہی نظر آتی ہے کیونکہ اس دنیا میں جو سب سے پہلے انسان آئے وہ حضرت آدمؑ اور جناب حواؑ ہی تھیں کہ جہاں سب سے پہلے الٰہی نمائندے نے دنیا کو ستر پوشی سے روشناس کرا کر ادب و اخلاق کی بنیاد ڈالی اور حضرت ہابیل کو زمین میں دفن کر کے مرنے کے بعد بھی انسان حرمت کو آشکار کیا۔

اس کے بعد دنیا کی قدیم تہذیبوں میں، مصر، یونان اور ایران کی تہذیبوں کا بھی ذکر آتا ہے لیکن جب ہم آج کے موجودہ دور کے حوالے سے دیکھتے ہیں تو ہمیں دنیا بھر میں یورپی کلچر کا غلبہ نظر آتا ہے۔ حالانکہ یورپی کلچر کی تاریخ بہت پرانی نہیں ہے لیکن انگریزوں کے تسلط اور پھر بعد از اس سائنس اور ٹیکنالوجی میں ان کی بالادستی نے یورپی تہذیب کو پھلنے پھولنے میں بہت مدد دی۔

اس حوالے سے جب ہم یورپی تہذیب کے غیر یورپی ممالک پر اثرات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں یورپی ممالک کا غیر یورپی ممالک پر حکومت کرنے کا بہت زیادہ دخل ہے۔

اب کیونکہ غیر یورپی ممالک جن میں کچھ اسلامی ممالک بھی شامل ہیں سینکڑوں سال یورپ کے ماتحت رہے تو یہاں کے عوام میں ایک احساس کمتری نے جنم لیا اور ان ممالک کے افراد نے یورپی کلچر کو بڑے پن کا مظہر سمجھتے ہوئے اپنا لیا۔

آپ دیکھیں کے ہمارے ملک میں ایلیٹ کلاس کہلانے والوں کے علاوہ غریب طبقے کی مستورات بھی خصوصاً شادی بیاہ کے موقع پر مجالس اور نیم عریاں لباس صرف۔ لیے زیب تن کرتی ہیں تاکہ خود کو بھی ایلیٹ کلاس کا فرد ظاہر کر سکیں کیونکہ ان کے پاس خود کو بڑا ظاہر کرنے کا یہ ہی واحد راستہ ہے۔

ان تمام باتوں سے ہٹ کر جب ہم اسلام کے مقابلے پر یورپی تہذیب کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اس وقت اسلام اور اس کی تہذیب کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے اور اسلامی تہذیب کے مقابلے پر یورپی تہذیب انتہائی پست نظر آتی ہے۔

آپ دیکھیں اسلام نے جب طرح انسان کے معاشرتی حقوق کو واضح کیا ہے وہ اس دنیا میں جنت سے کم نہیں کہ جہاں ایک

جانب بیٹی کو پیدا ہوتے ہی زندہ درگور ہونے سے بچایا تو دوسری جانب ماں باپ کو شفیق اور مہربان بن کر اولاد کو ناز و نعم سے پالنے کے علاوہ ان کی تعلیم اور تربیت کا ذمہ دار ٹھہرایا اور پھر ان کی نئی ذمہ داریوں یعنی شادی بیاہ کے انتظامات کرنے کی ذمہ داری بھی عائد کی۔

اس کے علاوہ اولاد پر بوڑھے ماں باپ کی کفالت کی ذمہ داریاں بھی ڈالیں اور یہاں تک کہا گیا کہ اگر ماں باپ بوڑھے ہو جائیں تو ان کو کسی بات پر اُف تک نہ کہنا۔

جب کہ آپ دوسری جانب یورپی کلچر کو دیکھیں کہ جہاں بچے کو اسکول جاتے ہی پہلے دن جو باتیں بتائی جاتی ہیں ان میں ایک فون نمبر دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اگر تمھارے ماں باپ تمھیں کچھ کہیں تو فوراً اس نمبر پر پولیس کو مطلع کرنا ہم آ کر تمھیں لے جائیں گے۔ یہاں پر آوٴ کہنے سے مراد مار پیٹ نہیں بلکہ ہر وہ بات کہ جو تمھاری مرضی کے خلاف ہو وہ ماں باپ کے لیے قابل سرزنش ہے۔ اس طرح والدین کی حقوق سلبی کی وجہ سے پورے معاشرے میں بے راہ روی اور ایک دوسرے کا خیال نہ رکھنے کے رجحانات بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔

کلچر میں دیکھیے وہاں پاکی اور ناپاکی کا تصور نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ ٹائلٹ جانے کے بعد پانی سے واش نہیں کرتے بلکہ پانی کی جگہ ٹشو پیپر استعمال کرتے ہیں۔ آپ اگر بغور جائزہ لیں تو ان کا یہ عمل حیوانوں سے مختلف نہیں۔

اب جہاں تک اسلام کے حوالے سے جدید تہذیب کی بات کی جائے تو اس میں ہمارے سامنے سے واضح اور بہترین مثال انقلاب اسلامی ایران کی ہے کہ جہاں انقلاب اسلامی کے بعد عورت وہاں کے تمام امور میں گاڑی کے دوسرے پہیے کی حیثیت سے موجود ہے۔ بس اس سلسلے میں شرط ہے تو یہ کہ عورت اسلامی شعار کو اپنائے۔ آپ دیکھیں اسلامی شعار کو اپنائے ہوئے عورتیں مقامی اور بین الاقوامی طور پر کھیلوں میں حصہ لیتی ہیں اور حتیٰ کہ یورپی ممالک میں بھی انعام حاصل کرنے کے موقع پر مرد اگر انعام دینے کے بعد ہاتھ ملانا چاہے تو وہ معذرت کر لیتی ہیں۔

اس طرح یہ اسلامی تہذیب ہی ہے کہ جو قیامت تک آنے والے ہر حالات میں انسان کی عظمتوں اور حقوق کا خیال رکھتی ہے۔ اس لیے اپنی ان خصوصیات کی وجہ سے اسلامی تہذیب غیر مسلموں پر اثر انداز ہو کر اسلام کے فروغ کا حصہ بن رہی ہے۔

□□□□□

جدید اسلامی تہذیب نظریہ اور خدوخال

آیت اللہ خامنہ ای حفظ اللہ کے خطابات کی روشنی میں

سید اسد عباس

تہذیب کے لغوی معنی و مفہوم

تہذیب ایک وسیع مفہوم کا حامل لفظ ہے جس سے مراد کسی چیز کی کانٹ چھانٹ اور سنوارنا بھی ہے اور اس سے مراد انگریزی لفظ Civilization کا اردو معنی بھی۔ اردو میں تہذیب اپنے پہلے معنی میں استعمال ہوتا رہا تاہم سرسید احمد خان نے پہلی مرتبہ لفظ تہذیب کو Civilization کے معنی میں استعمال کیا، وہ اپنے مجلّے تہذیب و اخلاق میں لکھتے ہیں:

"جب ایک گروہ انسانوں کا کسی جگہ اکٹھا ہو کر بستا ہے تو اکثر ان کی ضرورتیں اور ان کی حاجتیں، ان کی غذائیں اور ان کی پوشاکیں، ان کی معلومات اور ان کے خیالات، ان کی مسرت کی باتیں اور ان کی نفرت کی چیزیں سب یکساں ہوتی ہیں اور اسی لیے برائی اور اچھائی کے خیالات بھی یکساں ہوتے ہیں اور برائی کو اچھائی سے تبدیل کرنے کی خواہش سب میں ایک سی ہوتی ہے اور یہی مجموعی خواہش تبادلہ یا مجموعی خواہش سے وہ تبادلہ اس قوم یا گروہ کی سولایزیشن ہے۔" مقالات سرسید جلد ۶ صفحہ ۳۔ لاہور ۱۹۶۲

انگریزی لفظ Civilization فرانسیسی اور لاطینی الفاظ سے ماخوذ ہے۔ ثقافت اور تہذیب کو ہمیشہ گڈمڈ کیا جاتا رہا ہے تاہم ایک بات جو واضح ہے کہ ایک تہذیب میں کئی ایک چھوٹی ثقافتیں موجود ہو سکتی ہیں یعنی تہذیب یا سولائزیشن کئی چھوٹی ثقافتوں نیز دیگر مظاہر پر مشتمل ایک بڑی ثقافت ہے۔ تہذیب ایک علمی موضوع ہے لیکن مجھے عادت ہے کہ میں چیزوں کو سادہ انداز سے سمجھتا اور بیان کرتا ہوں۔ زیر نظر تحریر میں بھی میری کوشش ہوگی ہے کہ تہذیب اور اس سے جڑی مشکل اصطلاحات اور پیچیدہ نظریات کو سادہ اور عام فہم الفاظ میں بیان کروں۔

مغربی دانشوروں اور میڈیا پر ہم Civilized اور اس کے مقابل Third world Countries کی اصطلاح عام طور پر سنتے ہیں۔ مغرب اپنے علاوہ ممالک کو Un Civilized کہنے کے بجائے نسبتا بہتر نام سے پکارتا ہے۔ ہمیں جاننے کی ضرورت ہے کہ مغرب کی Civilization سے کیا مراد ہے۔ میری نظر میں مغربی معاشرے میں قانون کی حکمرانی، عوامی حکومت، عدالت، انصاف، علمی و سائنسی پیشرفت، وسائل کی بہتات، مالی نظام کی تشکیل، غلامی کے خاتمے، اظہار کی آزادی، معاشرتی فلاح و بہبود وغیرہ کو تہذیب کے مظاہر کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اس تہذیب کی کچھ فلسفی بنیادیں بھی ہیں جیسے سیکولرزم، جمہوریت، انسانی حقوق وغیرہ۔ مغرب کی اس تہذیب سے کئی ایک اقوام، ممالک اور ثقافتیں جڑی ہوئی ہیں۔

تہذیبیں اور ان کے عناصر

سوال یہ ہے کہ کیا دنیا میں فقط مغربی تہذیب ہی موجود ہے یا اس کے علاوہ بھی تہذیبیں ہیں اور مغربی تہذیب سے قبل کیا صورتحال تھی۔ ہمیں جانتے ہیں کہ دنیا میں بہت سی تہذیبیں موجود تھیں جن کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ دریائے نیل کی تہذیب، دجلہ وفرات کی تہذیبیں، موہنجوداڑو کی تہذیب، بدھ مت دور کی تہذیب، چین کی قدیم تہذیب، یورپ کی قدیم تہذیب، جاپانی تہذیب، ہندو تہذیب، خانہ بدوش تہذیب، قبائلی تہذیبیں، افریقی تہذیب، رومی تہذیب اور قدیم ایران کی تہذیب وغیرہ۔ ہر تہذیب کی اپنی اپنی خصوصیات اور خدوخال نیز دائرہ کار ہے۔ ایرانی، مصری، بابل، چین، جاپان، موہنجوداڑو، بدھ مت تہذیب کے مخصوص علاقے تھے جس کا مرکزی عنصر علاقہ تھا۔ خانہ بدوش اور قبائلی تہذیب کا مرکزی عنصر قبائلی روایات ہیں۔ بدھ مت اور ہندو تہذیب مذہب کے گرد مرکوز ہیں۔ بعض قدیم تہذیبیں اب بھی موجود ہیں جن میں ممکن ہے حالات کے مطابق کچھ تبدیلیاں آئی ہوں لیکن اصل تمدن اب بھی موجود ہے جیسا کہ چینی تہذیب، جاپانی تہذیب، قبائلی تہذیبیں، عرب تہذیب۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بعض تہذیبوں کی علمی اور فلسفی بنیادیں ہوتی ہیں اور بعض تہذیبیں کم از کم علمی بنیادوں سے عاری ہوتی ہیں ان کی بنیاد علم کے بجائے نسل، خون، علاقہ وغیرہ ہو سکتا ہے۔

میری نظر میں آج کی مغربی تہذیب کا مرکزی عنصر مادی ترقی ہے۔ اس ترقی کے حصول کے لیے اخلاقیات بھی ہے، قوانین بھی ہیں اور انسانیت بھی۔ عرب، قبائلی، چینی، جاپانی، ہندو تہذیب سے تعلق رکھنے والا شخص جب فکری اور عملی طور پر مغربی تہذیب کو اختیار کر لیتا ہے تو وہ ایک ہی وقت میں دو تہذیبوں کا رکن قرار پاتا ہے۔ پس ظاہر ہوا کہ انسانی معاشرے میں اس وقت کئی تہذیبیں موجود ہیں اور انسان ایک ہی وقت میں ایک یا ایک سے زائد تہذیبوں سے متمسک ہو سکتے ہیں۔ عموماً نسل، علاقہ یا زبان کے محور پر قائم تہذیبوں کے افراد دنیا میں حاکم تہذیبوں کا اثر قبول کرتے ہیں اور اسے اختیار کرتے ہیں تاہم علاقہ، زبان اور نسل کی بنیاد پر قائم تہذیبیں عموماً دیرپا ہوتی ہیں اور جلد معدوم نہیں ہوتیں جبکہ ان کے مقابل نظریاتی یا انسانی قوانین کے زیر اثر تشکیل پانے والی تہذیبیں نظریہ اور فکر بدلنے کے ساتھ ہی تاریخ کی بھول بھلیوں کا شکار ہو جاتی ہیں اور ان کے آثار، آثار قدیمہ میں شمار ہونے لگتے ہیں۔

جدید اسلامی تہذیب آیت اللہ خامنہ ای کا نقطہ نظر

مسلمانوں کے اس اقتدار کا خاتمہ سلطنت عثمانیہ کے ساتھ ہوا اور اس کے بعد مغربی تہذیب ایک مقتدر قوت کے طور پر ہمارے سامنے ظاہر ہوئی۔ حال ہی میں انقلاب اسلامی ایران کے روحانی پیشوا نے انقلاب اسلامی کے دوسرے مرحلے میں ایک جدید اسلامی تہذیب کی تشکیل کا عندیہ دیا ہے۔ جدید اسلامی تہذیب سے کیا مراد ہے یہ ہم سید علی خامنہ ای کے اقوال سے ہی سمجھیں گے۔ تاہم ایک چیز بدیہی ہے کہ یہ تہذیب مغربی مادہ پرست تہذیب کے مقابل خدا پرست تہذیب ہے جس کا بنیادی محور مادی ترقی کے بجائے انسان کی ہر دو جہتوں یعنی مادی اور معنوی ترقی سے عبارت ہے اور اس کا فلسفہ یکتا پرستی پر مبنی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ مغرب کی مادہ پرست تہذیب نے انسان کو معنوی طور پر نہایت کھوکھلا کر دیا ہے، اس تہذیب کے قوانین اور اخلاقیات میں موجود اچھائیاں کھوکھلی ہیں۔ اگر مادی فائدہ نہ ہو تو مغربی تہذیب کا انسان ایک وحشی درندے سے کم نہیں۔ انسانی حقوق، خواتین کی آزادی، بچوں کے حقوق، اقوام کے حقوق، قیدیوں کے حقوق، جانوروں کے حقوق سب کا ہدف مادی منفعت ہے۔ اگر مادی منفعت نہیں تو یہ سب

باتیں بے معنی ہوجاتی ہیں اوران حقوق کے چمپیئن ہلاکو، چنگیز اور دنیا میں بربریت کی دیگر مثالوں سے کسی طور کم نہیں رہتے۔ ہیرو شیما، ویتنام، افغانستان، عراق، لیبیا، شام، یمن، صومالیہ، فلسطین، کشمیر غرضیکہ دسیوں مثالیں اسی مغربی تہذیب کی بربریت کے شاہکار ہیں۔

اقوام عالم مادہ پرست تہذیب کی دو انتہاؤں یعنی سرمایہ داری نظام اور اشتراکیت کو جھیل چکے ہیں۔ اپنے بنیادی فلسفہ کے سبب ہر دو نے انسانی معاشرے کو تکلیف اور کرب کے سوا کچھ نہیں دیا۔ اشتراکیت نے انسان سے ملکیت کا حق چھین کر ریاست کو مضبوط کیا تو سرمایہ دارانہ نظام نے فرد کو مضبوط کر کے طبقاتی تقسیم کو رواج دیا جس سے انسانی معاشرے سرمایہ کی بنیاد پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے۔ امریکہ، یورپ اور مغربی تہذیب کے دیگر مراکز میں یہ تقسیم اب کھل کر سامنے آ چکی ہے۔ ننانوے فیصد عوام کے وسائل پر ایک فیصد اشرافیہ کا قبضہ اسی تہذیب کا شاخسانہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ انسانیت کے پاس موجودہ کھوکھلے اور یک جہتی نظام سے نکلنے کی کیا سبیل ہے؟ کیا دنیا میں موجود تہذیبوں میں سے کسی تہذیب کے پاس وہ سرمایہ اور علمی بنیادیں ہیں جو انسان کی مشکلات کا ایک جامع حل پیش کر سکیں۔ کیا کوئی ایسا نظام موجود ہے جو انسان کی مادی اور معنوی بہبود کا خیال رکھے اور یہ عمل ایک اعتدال کے ساتھ انجام دیا جائے۔ اس سوال کا جواب فقط "اسلام" ہے۔

اسلام یعنی آدم سے خاتم تک انسانوں کی ہدایت کے لیے بھیجا گیا دین۔ یہ وضاحت اس لیے ضروری تھی کہ اسلام سے کوئی شخص عیسائیت، یہودیت کے مقابل ایک مذہب نہ سمجھے۔ اس اسلام سے مراد وہ آفاقی تعلیمات ہیں جو اللہ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے انسانوں کو دیں تا کہ ایک عادلانہ اور منصفانہ معاشرہ تشکیل پا سکے۔

جدید اسلامی تہذیب کے عناصر؟

رہبر انقلاب اسلامی سید علی خامنہ ای کا کہنا ہے کہ عالم اسلام کی ذمہ داری ہے کہ وہ دنیا میں ایک نئی روح پھونکے جیسا کہ ختمی مرتبتؐ نے کیا تا کہ ایک نیا ماحول تشکیل دیا جائے اور نئی راہیں کھلیں۔ ہم اس نئے تصور کو "جدید اسلامی تہذیب" کا نام دیتے ہیں۔ ہمیں انسانوں کے لیے اس نئی تہذیب کی تگ و دو کرنی ہے۔ یہ تصور اس تصور سے بالکل مختلف ہے جو آج کی طاقتیں انسان کے بارے میں رکھتی ہیں۔ اس سے مراد زمینوں کو فتح کرنا نہیں ہے۔ اس سے مراد اقوام کے حقوق غصب کرنا نہیں ہے۔ اس سے مراد کسی پر عقائد اور ثقافت کو مسلط کرنا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد اقوام کو ایک الٰہی تحفہ پیش کرنا ہے تا کہ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے درست راہ کا انتخاب کریں۔ آج عالمی طاقتیں اقوام کو جس راہ پر لے آئی ہیں وہ غلط اور بھٹکا ہوا راستہ ہے۔ یورپ کے لوگوں نے مسلمانوں کے علم اور فلسفہ کو استعمال کرتے ہوئے ایک نئی تہذیب کی بنیاد رکھی جو کہ مادی تھی۔ عیسوی کیلنڈر کے سولھویں اور سترویں صدی میں اس نئی تہذیب کی تشکیل کا آغاز ہوا۔ ایک جانب یورپی اقوام نوآبادیاتی نظام کے ذریعے اقوام کو فتح کرنے اور ان کے وسائل کو لوٹنے کی جانب متوجہ ہوئیں اور دوسری جانب اندرونی طور پر انھوں نے علم، صنعت اور تجربہ کے ذریعے اپنے آپ کو اندرونی طور پر مضبوط کیا۔ یوں یہ تہذیب انسانی معاشرے پر تسلط میں کامیاب ہوئی۔ یہی ہے جو یورپی اقوام نے گذشتہ چار یا پانچ صدیوں میں کیا ہے۔

ان کی پیش کردہ تہذیب نے دنیا کو ٹیکنالوجی، رفتار، آسائش کے خوبصورت مظاہر پیش کیے، تاہم یہ لوگوں کو خوشی اور انصاف

مہیا نہ کر پائے۔ اس کے برعکس اس تہذیب نے انصاف کے سر پر وار کیا، اقوام کو محکوم کیا، کچھ اقوام میں پسماندہ رکھا اور کچھ کو غلام۔ اس تہذیب میں خود اپنے اندر تناقضات تھے۔ اخلاقیات اور معنویت کے لحاظ سے یہ معاشرے کھوکھلے ہو گئے۔ مغربی اقوام آج ان مسائل سے دو چار ہیں۔ بہت سے مغربی سیاستدانوں نے مجھے کہا کہ ان کی دنیا خالی اور کھوکھلی ہے اور وہ اسے محسوس کر رہے ہیں۔ وہ درست محسوس کر رہے ہیں اس تہذیب کا ایک خوشنما ظاہر ہے لیکن اس کی حقیقت انسانیت کے لیے نہایت خطرناک ہے۔ آج مغربی تہذیب کے تناقضات ظاہر ہو رہے ہیں، ان کا اظہار یورپ، امریکا اور ان کے زیر تسلط علاقوں میں مختلف شکلوں میں ہو رہا ہے۔

اب ہماری باری ہے، اسلام کی باری ہے۔ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (یہ زمانے کے نشیب و فراز ہیں جنھیں ہم اقوام کے مابین گردش دیتے ہیں آل عمران: 114) آج مسلمانوں کی باری ہے کہ وہ اپنے ارادے سے ایک نئی اسلامی تہذیب کی بنیاد رکھیں۔ جیسا کہ کل یورپ نے مسلمانوں نے علم اور حکمت سے استفادہ کرتے ہوئے ایسا کیا ہم بھی موجودہ زمانے کے علم سے استفادہ کر رہے ہیں۔ ہم موجودہ دور کے آلات کا استعمال کر رہے ہیں تا کہ ایک نئی اسلامی تہذیب کی بنیاد رکھیں۔ (29 دسمبر 2015)

جدید اسلامی تہذیب میں اتحاد کے مراحل

رہبر انقلاب اسلامی نے 15 نومبر 2019 میں اپنے ایک خطاب میں فرمایا کہ ریاست اسلامی اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ اتحاد امت اپنے حقیقی معنوں میں ایک ضرورت ہے۔ اور اس کی مثالیں بھی موجود ہیں یہ ہمارے وقت سے مخصوص نہیں ہے۔ ایک عظیم مرجع تقلید جو ہماری جوانی میں پوری شیعہ قوم کے مرجع تقلید تھے اتحاد اسلامی کے داعی تھے۔ انھوں نے اسلامی مکاتب کے مابین اتحاد کی سنجیدگی سے ترویج کی۔ وہ عالم اسلام میں اہل سنت علماء سے قریبی روابط رکھتے تھے اور ان سے مکالمے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ یہ ایک قلبی اور گہرا عقیدہ ہے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں یا ایسے ظاہر کرتے ہیں کہ جیسے (اتحاد امت) ایک سیاسی حربہ ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے اس کی بنیاد ایمان ہے اور ہم یقین رکھتے ہیں اللہ نے ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔

یقیناً اتحاد اسلامی کے مختلف درجے ہیں۔ سب سے کم ترین درجہ یہ ہے کہ اسلامی معاشرے، اسلامی ممالک، اسلامی حکومتیں، اسلامی اکائیاں اپنی حدود سے تجاوز، ایک دوسرے کے مقابل آنے اور نقصان پہنچانے سے اجتناب کریں۔ یہ پہلا درجہ ہے۔ اس سے اگلا درجہ یہ ہے کہ عالم اسلام اپنے مشترکہ دشمن کے مقابل ایک دوسرے کے تحفظ کے لیے متحد ہوں۔ یہ اعلیٰ درجہ ہے۔ اس سے بھی اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ اسلامی ریاستیں ایک دوسرے کی مدد کریں۔ اسلامی ممالک کی سائنس، سرمایہ، امنیت اور سیاسی قوت میں ایک جیسا مقام نہیں ہے۔ یہ ان موارد میں ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں۔ اس سے بھی بلند درجہ یہ ہے کہ عالم اسلام اسلامی تہذیب کے حصول کے لیے متحد ہو جائے۔ ریاست اسلامی نے اسی مقصد کو اپنا اصلی ہدف قرار دیا ہے۔ ایک ایسی تہذیب جو موجودہ دور کی ضروریات سے ہم آہنگ ہو۔

ارادے کی اہمیت اور ضرورت

رہبر انقلاب اسلامی نے 21 مارچ 2019 کے ایک خطاب میں کہا کہ مغرب اور امریکہ اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں اگر ایرانی قوم کوئی ارادہ کرتی ہے تو وہ یقیناً اپنے مقصد کو پالے گی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ وہ ایرانی عوام کے ارادہ سے نہیں لڑ سکتے ہیں۔ اگر ایرانی قوم کوئی ارادہ کرتی ہے تو اس کی راہ میں رکاوٹیں کرنا یا سازشیں کرنا بے فائدہ ہے۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ ان کو کیا کرنا چاہیے؟ وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کچھ ایسا کیا جائے جس سے ایرانی قوم ارادہ نہ کرے۔ وہ ایرانی قوم کی ارادہ کی طاقت کو کمزور کرنے کا سوچ رہے ہیں۔ آج ہمارے نوجوانوں کے سیاسی اور مذہبی عقائد میں اختلافات پیدا کرنے کے لیے لاکھوں ڈالر خرچ کیے جا رہے ہیں تاکہ ان میں بڑھنے کا عزم معدوم ہو جائے۔ وہ ہماری قوت ارادی کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ آپ کو فیصلہ کرنے سے روکنا چاہتے ہیں۔ ان کی توجہ اس پر مرکوز ہے کہ آپ کی قوت ارادی کو پیش رفت، مقاومت اور جدید اسلامی تہذیب کی جانب بڑھنے سے روکے۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ قوت ارادی پختہ ہو چکی ہے اور یہ یقیناً اپنا ہدف حاصل کر لے گی۔ ایسا وہ پہلے بھی کر چکے ہیں، طاغوتی رژیم کی حکومت کے دوران میں انھوں نے نوجوانوں کے مابین اس تصور کو رواج دیا کہ کہ اگر آپ ترقی اور تمدن چاہتے ہیں تو آپ کو مذہب کو ایک جانب رکھنا ہوگا۔ وہ کہتے تھے کہ مذہبی رواداری اور مذہبی عقائد سائنس، ترقی اور ایسی ہی چیزوں سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ آج بند آنکھوں کو کھولنے کی ضرورت ہے وہ ہماری بہترین، عظیم ترین اور جدید ترین صنعتوں کو دیکھیں، ہم اس صنعتی پیشرفت میں بہترین ممالک کی فہرست میں ہیں اور دنیا میں پہلے نمبر کے ممالک کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ ان جوانوں نے تشکیل دیا ہے جو دعائے کمیل پڑھتے تھے، جو تہجد ادا کیا کرتے تھے، جو اعتکاف انجام دیتے تھے، جو دعائے ندبہ کا شغف رکھتے تھے اور نیک تھے۔ ہم جدید صنعتوں نینو ٹیکنالوجی، نیوکلیائی ٹیکنالوجی، میزائل ٹیکنالوجی اور دیگر پیشرفتہ ٹیکنالوجی کے میدانوں میں اس وقت دنیا کے ممالک میں سرفہرست ہیں۔ یہ سب کرنے والے ایماندار نوجوان ہیں جو مجھ سے بہت قریب ہیں۔ نوجوانوں کو سائنس، دانش، سیاست اور محنت کے میدانوں میں اپنی کاوشوں کو بڑھانا ہوگا، ان کو فرعی اور غیر ضروری امور کی جانب توجہ نہیں دینی چاہیے۔ ان کو ایسے امور میں نہیں پڑنا چاہیے جو اختلاف کا باعث بنتے ہیں۔

رہبر انقلاب اسلامی نے جدید اسلامی تہذیب کے خدوخال کو بیان   کرتے ہوئے نوجوانوں کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ معنوی لوازمات کا حصول دنیاوی اور فوجی لوازمات کے حصول سے زیادہ اہم ہے۔ فوجی لوازمات میں گولے، ٹینک، میزائل یا اسی طرح کی دیگر صلاحتیں شامل ہیں۔ میں نے ہمیشہ نوجوانوں کی اہمیت پر زور دیا ہے، آپ جانتے ہیں کہ میں نوجوانوں سے کس قدر رغبت رکھتا ہوں اور مستقبل کے حوالے سے ان سے پر امید ہوں، لیکن یہاں یہ جاننا اہم ہے کہ وہ کون سے جوان ہیں جو ہماری اس تحریک کو ایک جدید اسلامی تہذیب کی تشکیل کی جانب لے جا سکتے ہے؟ وہ کیسے دکھتے ہیں؟ یہ وہ مقام ہے جہاں معنوی لوازمات اہم ہو جاتے ہیں۔ وہ جوان جو پر عزم ہیں، مذہبی ہیں، بابصیرت ہیں، جو اپنی طاقت پر بھروسہ کرتے ہیں، جو کام کرنے اور تخلیق کرنے پر یقین رکھتے ہیں، جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور خود اعتماد ہیں یہی جوان ملک کو آگے لے جا سکتے ہیں۔ یہ اس کے بالکل برعکس ہے جو دشمن ہمارے جوانوں کے بارے چاہتا ہے۔ دشمن چاہتا ہے کہ ہمارے جوان پر عزم نہ ہوں، وہ مذہبی نہ ہوں، ناامید ہوں، شہوت کا شکار ہوں، سست اور کاہل ہوں، کام کرنے سے کترائیں اور ہر وقت شکوہ کریں، نشہ کی لت میں پڑے ہوں اور کمزور ہوں۔

رہبر انقلاب نے 11 فروری 2019 کے ایک خطاب میں کہا کہ عزیزو! آپ نہیں سیکھ سکتے تجربے کے بغیر یا دوسروں کے تجربات کو سنے بغیر۔ جو کچھ ہم نے تجربہ کیا ہے آپ میں سے اکثر اس سے نہیں گزرے۔ ہم نے دیکھا ہے اور آپ دیکھیں گے۔ اگلی دہائیاں آپ کی دہائیاں ہیں اب آپ کی ذمہ داری ہے کہ آپ اپنے انقلاب کی مکمل اہلیت اور عزم کے ساتھ حفاظت کریں اور اس انقلاب کو اس کے منتہی یعنی ایک جدید اسلامی تہذیب کی جانب اور ولایت کے عظیم سورج امام مہدی عج کے طلوع کی تیاری کی جانب لے کر جائیں۔ مستقبل کی جانب تیز قدم بڑھانے کے لیے ہمیں ماضی اور تجربات کا فہم حاصل کرنا ہوگا۔ اگر اس حکمت عملی کو پس پشت ڈالا گیا تو جھوٹ سچ کی جگہ لے لے گا اور مستقبل نامعلوم خطرات سے بھر جائے گا۔

جدید اسلامی تہذیب کے ثمرات

رہبر انقلاب نے 11 نومبر 2015 کے ایک خطاب میں جدید اسلامی تہذیب کے ثمرات پر بات کرتے ہوئے کہا کہ اسلامی حکومت کے قیام کا مقصد ایسے مثالی معاشرے کی تشکیل ہے جو اسلام ہم سے چاہتا ہے۔ یہ ایک ایسا معاشرہ ہے جس میں علم، پیشرفت، حرمت، عدالت، عالمی لہروں کے مقابلے کی طاقت اور دولت ہوتی ہے۔ ہم اسے جدید اسلامی تہذیب کہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا ملک اس درجے تک پہنچے۔ رہبر انقلاب نے 21 مئی 2014 کے اپنے ایک خطاب میں جدید تہذیب کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ مستقبل قریب ایک اسلامی تہذیب کو تشکیل دے رہا ہے ایک نئی تہذیب جو آج کے انسان کے صلاحیتوں اور ضروریات کے مطابق ہے۔ انسان نے گذشتہ صدیوں میں ہونے والے حادثات میں بہت سے زخم اٹھائے ہیں۔ آج کا انسان زخمی اور افسردہ ہے۔ نوجوان اختلاف، ناامیدی اور ذہنی تناؤ کا شکار ہیں۔ اسلام نسل نو کو نئے افق تلاش کرنے میں مدد کرسکتا ہے۔ وہ ان کے دلوں میں وہ خوشی بھر سکتا ہے اور انھیں وہ احترام لوٹا سکتا ہے جس کے وہ حقدار ہیں۔ جدید اسلامی تہذیب سے یہی مراد ہے۔ آپ لوگ اس تہذیب کی تشکیل میں اہم ترین اور مرکزی نقطہ ہیں۔ مستقبل آپ کا ہے۔

گذشتہ چند تحریروں میں کوشش کی گئی کہ انقلاب اسلامی کے رہبر سید علی خامنہ ای کے ارشادات کی روشنی میں جدید اسلامی تہذیب کے تصور کو بیان کیا جائے۔ رہبر انقلاب اسلامی ہی جدید اسلامی تہذیب کے تصور کو پیش کرنے والی شخصیت ہیں لہذا وہی اس نظریہ اور اس کے خدوخال کو بہتر طور پر بیان کرنے کے بھی اہل تھے لہذا میں نے انھی کے اقوال پر اکتفا کیا۔ رہبر انقلاب کے جدید اسلامی تہذیب کے عنوان سے خطابات میں اس تصور کی اجمالی اور فلسفی بنیادیں موجود ہیں نیز اس تہذیب کے خدوخال اور ثمرات کو بھی بیان کیا گیا ہے تاہم ضرورت اس امر کی ہے کہ اس موضوع پر عالم اسلام میں ایک عظیم مباحثہ کی بنیاد رکھی جائے اور امت مسلمہ کے دانشور مسالک میں بٹے ہوئے اسلام کو اپنے حقیقی وجود کے ہمراہ شناخت کریں یعنی خالص اسلامی تعلیمات کا تعین کریں اور مسلکی روشوں کو ان سے جدا کریں تبھی وہ اس قابل ہوں گے کہ مسلکی طبقوں میں بٹے مسلمانوں کو ایک ہدف کے لیے متحد کر سکیں اور جدید اسلامی تہذیب کی بنیاد رکھ سکیں تا کہ اسلام کی آفاقی اور ہمہ جہت تعلیمات کے زیر سایہ اقوام عالم جو بقول رہبر موجودہ مغربی تہذیب کے ہاتھوں زخمی، افسردہ اور کھوکھلی ہو چکی ہیں حقیقی سعادت، خوشی اور حرمت کو پا سکیں۔

□□□□□

سلام بحضور امام حسینؑ

ثاقب اکبر مرحوم

ہم سوئے وارثِ الطاف و نعم جاتے ہیں
لے کے نذرانہ پئے کسبِ کرم جاتے ہیں

زلف تھامے ہوئے کندھے پہ ہے نعم المراکب
گردشِ شہر کو یوں شاہِ اممؑ جاتے ہیں

تیرے احرام سے کعبے کی مہک آتی ہے
تیرے قدموں کے نشاں سوئے حرم جاتے ہیں

تری دہلیز پہ استادہ ہے جبریلِ امیں
اور ملائک تری آواز پہ تھم جاتے ہیں

لوحِ محفوظ کی تحریر پہ تیری نظریں
جہاں سکانِ سماوات بھی کم جاتے ہیں

تیری یادوں کے چراغوں سے دل و جاں روشن
تیرا غم ہو تو سبھی رنج و الم جاتے ہیں

آدمؑ و نوحؑ و براہیمؑ کا وارث تو ہے
حق کے سب راہی ترے زیرِ علم جاتے ہیں

ذکر تیرا ہے کہ تاریخ سفر کرتی ہے
راہ روشن ہے جدھر تیرے قدم جاتے ہیں

کربلا چل کر روانہ ہیں ترے مقتل کو
پشت سیدھی ہے تو ابروؤں کے خم جاتے ہیں

مجلسِ شاہ میں سادات کا غم بٹتا ہے
ثاقبؔ اٹھو کہ گدایانِ کرم جاتے ہیں

آیت اللہ العظمیٰ آصف محسنیؒ کی رحلت جانسوز پر نذرانہ عقیدت

ثاقب اکبر
تلمیذ ناچیز (آیۃ اللہ العزیز الشیخ محمد آصف محسنی اعلیٰ اللہ مقامہ)

نور ہی نور تھا روشنی روشنی
خیر ہی خیر تھا راہ حق کا دھنی
داد و تحسین سے تھا ہمیشہ غنی
آصف محسنی آصف محسنی

معرکہ زن رہا ظلم و ظلمات سے
قوم کو کھینچ لایا سیہ رات سے
اہل باطل سے جس کی نہ ہرگز بنی
آصف محسنی آصف محسنی

آج صحن چمن سے ہویدا ہوا
وہ گیا تو خلا جیسے پیدا ہوا
رُوح پرواز کی، اُڑ گئی روشنی
آصف محسنی آصف محسنی

فیض صحبت سے ناقص بھی کامل ہوئے
کتنے اس کے مریدوں میں شامل ہوئے
آ گئے کتنے پھر چھوڑ کر دشمنی
آصف محسنی آصف محسنی

ایسا توحیدِ اُمت کا داعی گیا
خود رہا بن کے اُمت میں حبلِ خدا
قاسم خیر تا لحظۂ جاں کنی
آصف محسنی آصف محسنی

حق کی جانب رہا حق کی جانب گیا
حق کی خاطر جیا حق کی خاطر مرا
حق کی خاطر رہی دوستی دشمنی
آصف محسنی آصف محسنی

وہ قلم لے کے اُٹھا تو دیکھا گیا
وہ علم لے کے اُٹھا تو دیکھا گیا
دشمنوں کی صفوں میں رہی سنسنی
آصف محسنی آصف محسنی

درد دل میں ہے جاں میری رنجور ہے
غم کے کوہ گراں سے بدن چور ہے
اُس کے صدمۂ فرقت سے دل پہ بنی
آصف محسنی آصف محسنی

مکتب اہل بیت نبیؑ کا امیں
سوئے حق ہے سدھارا مگر بالیقیں
جھولیاں بھر کے، مکتب کو کر کے غنی
آصف محسنی آصف محسنی

علم فقہ و اصول و رجال و کلام
سیرت آل احمد علیہم سلام
در ہمہ وارد آثار جا ماندنی
آصف محسنی آصف محسنی

(روزِ رحلت: ۱۵اگست ۲۰۱۹)

ہرگز نہ مجھے آزاد کرو

ثاقب اکبر

جنرل ضیاء الحق کے دورِ استبداد میں شائع ہونے والی ایک نظم موجودہ حالات میں یاد آرہی ہے

زندانوں کو آباد رکھو
فریاد پہ کوڑے برساؤ
ہرگز نہ مجھے آزاد کرو
ہاں پھر بھی مجھے آزاد کہو
ہو جنبشِ لب تو جلدی سے
ہونٹوں پہ میرے ہاتھ رکھو
جو میرے گناہوں کو لکھیں
وہ فرشتے میرے ساتھ رکھو
جو کچھ وہ لکھیں اُسے سچ سمجھو
ہرگز نہ مجھے آزاد کرو
ہاں پھر بھی مجھے آزاد کہو
برسوں سے ستم پہ ستم سہ کر
دل زخمی، شکستہ پہلو ہے
اس عالم میں جب اشک بہیں
کہہ دو کہ خوشی کے آنسو ہیں
اور خون کو رنگِ حنا کہہ لو
ہرگز نہ مجھے آزاد کرو
ہاں پھر بھی مجھے آزاد کہو
تن پر جو پھٹے کپڑے دیکھو
کہہ دو دیوانہ، پاگل ہے
آنکھوں کے گرد سیاہی کو
کہو: کتنا اچھا کاجل ہے
بولوں تو کہو: خاموش رہو
ہرگز نہ مجھے آزاد کرو
ہاں پھر بھی مجھے آزاد کہو
تاریک قفس سے مت گزریں
تم تازہ ہواؤں سے کہہ دو
خوشبو کو گزرنے سے روکو
اور پہرے دار کو حکم کرو:
زنداں کا ڈسپلن ٹھیک رکھو
ہرگز نہ مجھے آزاد کرو
ہاں پھر بھی مجھے آزاد کہو
تجھے امن وطن محبوب رہے
ترا لاء اینڈ آرڈر خوب رہے
قانون کی بالا دستی ہو
قانون شکن معتوب رہے
چاہے قانون یزید کا ہو
ہرگز نہ مجھے آزاد کرو
ہاں پھر بھی مجھے آزاد کہو

ممبر شپ فارم

نام: .... ولدیت: ....

پتہ: ....

....

تعلیم: .... پیشہ: ....

فون: .... فیکس: ....

براہ کرم .... سال کے لیے پرچہ میرے نام جاری کر دیجیے۔

دفتری استعمال کے لیے

خریداری نمبر : .... تعارف کنندہ : ....

تاریخ اجراء : .... تاریخ اختتام : ....

دستخط سر کولیشن منیجر:

فروغ فکر و آگاہی کے لیے
ماہنامہ پیام اسلام آباد

رابطہ دفتر:
البصیرہ،
نزد امام بارگاہ امام علی ہادی،
شاہ اللہ دتہ، اسلام آباد
03065566771


The AIMS
School & College
FULL DAY AND BOARDING
دی ایمز
اسکول اینڈ کالج
ADMISSION OPEN
F.Sc. (Pre-Engineering, Pre-Medical)
ICS F.A I.Com
Boys and girls both can apply
Purpose built campus with complete educational environment
Merit and Need based Scholarships are available
Our institution boasts a state-of-the-art library and laboratory that will enhance your learning experience
Weekly seminar to advance your career counseling skills for Professional Development
• Multimedia Classes
• Sports Activities
• Transport facility
• Qualified Faculty
• Limited seats
• First come, first served
0300-5779540
www.theaimscollege.edu.pk
Near Toll Plaza,Murree Expressway, Islamabad